
فلسطین
الماس ایم اے

اس کا نام تو عظیم تھا۔ پر زمانے کے یزدانوں اور اہرمنوں نے اسے کوئی عظمت نہ دی۔ بلکہ روشنی اور تاریکی کی جنگ میں اس پر ایسے ستم ڈھاتے کہ اس سے اس کی زندگی کا ضمیر چھین کر اسے خدا کا منکر و ملحد بنا دیا۔ اس نے امن اور تہذیب کی بھیک مانگی۔ جواب میں ان نکھٹو لوگوں نے اسے غم اور شقاوت دیتے اس نے محنت کر کے ایک کامیاب انسان بننا چاہا لیکن سانپ کی طرح کینچلی بدلنے والے لوگوں نے اس کی جھولی میں گرسنگی اور فاقہ کشی ڈال دی۔ اسے ایک غیر مجاز انسان جان کر اور اس کے قلبی اسرار کو جانے بغیر اسے ایک مستعمل گیند کی طرح ادھیڑ کر رکھ دیا۔ ورنہ وہ نمانا تو دن رات محنت کر کے وابستگان کا پیٹ پال رہا تھا۔

آج بھی جب وہ گھر داخل ہوا تو بیحد خوش تھا۔ جاڑا اپنے عروج پر تھا اور

زمستانی ہوائیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ وہ بڑا مطمئن تھا مہینے کی یکم تھی اور اسے
تنخواہ ملی تھی۔ ہاتھ میں دو بنڈل پکڑے جب وہ اپنے گھر کے برآمدے میں داخل
ہوا تو وہاں اس کی ماں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے ماں کو سلام کیا
اور اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ ماں جس کا نام ریحانہ تھا۔ آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ
پکڑ کر سامنے والے کمرے میں لے گئی۔

کمرے میں دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ دونوں اس کی بہنیں تھیں۔ ایک جو جوان
تھی اس کا نام عطیہ تھا اور وہ بی۔ اے کر چکی تھی اور دوسری جو ننھی منی بچی تھی
صائمہ تھی اور تیسری میں پڑھتی تھی۔ بھائی کو دیکھتے ہی دونوں بہنیں کھڑی ہو
گئیں۔ عظیم نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

امی! قیصر اور عاصفہ کہاں ہیں۔

ریحانہ نے باہر صحن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دھوپ میں بیٹھے پڑھ رہے ہیں
قیصر عظیم کا چھوٹا بھائی تھا اور ایم۔ بی۔ اے کے آخری سال میں تھا۔ عاصفہ عظیم
کی منگیتر اور خالہ زاد تھی۔ اس کے ماں باپ کی رہائش گوجرانوالہ میں تھی اور وہ یہاں
اپنی خالہ کے ہاں رہ کر ایم۔ ایس۔ سی کر رہی تھی۔

ریحانہ کمرے کے دائیں طرف پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے صوفہ پر
عطیہ اور صائمہ بیٹھ گئیں۔ عظیم ماں کے پاس آبیٹھا۔ وہ دھیمے دھیمے مسکرا رہا تھا۔
اس نے اپنا سر ریحانہ کی گود میں رکھ دیا اور طفلانہ انداز میں کہا۔

امی! آج میں نے پہلی بار ایک حرکت آپ کی اجازت کے بغیر کی ہے۔ آپ

مجھ سے خفا تو نہ ہوں گی امی؟ --- ریحانہ اس کا سر سہلانے لگی۔ پھر جھک کر عظیم کی
پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

تم جیسے بیٹے سے میں خفا ہو سکتی ہوں؟

عظیم نے وہ دونوں پیکٹ جو وہ لیکر آیا تھا۔ ریحانہ کی گود میں رکھ دیئے۔

امی! میں عطیہ اور صائمہ کے لیے کپڑے اور جوتے خرید لایا ہوں۔ ان دونوں کے
پاس ایک ایک ہی جوتا ہے اور وہ بھی ٹوٹ رہا ہے۔ ویسے بھی بہت دنوں سے
میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کے لیے خود کوئی چیز خریدوں۔
ماں! میں نے غلطی تو نہیں کی؟ ریحانہ کی گود میں دوبارہ اس نے سر رکھ دیا تھا۔

عطیہ رو پڑی تھی اور منہ دوسری طرف پھیر کر سسکنے لگی تھی۔ ریحانہ کی آنکھیں
بھی آنسوؤں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے تھیں۔ عظیم نے چونک کر سر اوپر اٹھایا۔ پہلے غور
سے عطیہ کی طرف دیکھا پھر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے گھمبیر آواز اور مغموم لہجے میں
اس نے پوچھا۔

تم دونوں رو کیوں رہی ہو؟

ریحانہ نے آنسو پونچھ لیے۔

تم خود ہی تو رلانے والی باتیں کرتے ہو۔ اپنی بہنوں کے لیے کچھ خرید کر
لائے ہو تو میں کیوں خفا ہونگی۔ اللہ کرے قیصر بھی تم جیسا نکلے تو میں سمجھوں گی۔
میری کوکھ ٹھنڈی ہو گئی۔ عظیم نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دہرے کیے ہوتے
کچھ نوٹ اس نے ماں کی گود میں رکھ دیتے۔

مجھے آج تنخواہ مل گئی ہے امی! کچھ روپے میں دونوں بہنوں کے جوتوں کپڑوں
پر خرچ کر دیتے ہیں اور یہ بچے ہیں گن لیں۔
ریحانہ نے روپے لیکر مٹھی میں دبا لیے۔ عظیم نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
کہا بھوک لگی ہے امی!

عطیہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔
بھائی جان! باہر دو بالٹیوں میں پانی گرم ہونے کے لیے رکھا ہے پہلے اُٹھ
کر نہا لیں۔ اتنی دیر تک میں کھانا گرم کر لاتی ہوں۔
عظیم قمیض اتارنے لگا۔ ریحانہ اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ پھر برآمدے سے اس کی
آواز سنائی دی۔

عظیم! میں دونوں بالٹیاں غسل خانے میں رکھنے لگی ہوں۔ جلدی آ کر نہا لو نہ
تو پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ قمیض کندھے پر ہی رکھے عظیم بھاگتا ہوا باہر آیا اور دونوں
بالٹیاں ریحانہ سے اس نے چھین لیں۔ ریحانہ نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھتے
ہوئے پوچھا۔

یہ کیا بیٹے؟
عظیم غسل خانے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔
کیوں گنہگار کرتی ہیں امی! آپ نے بہت خدمت کی ہے اپنی اولاد کی
اب ہمارا کام ہے۔ آپ کی خدمت کریں۔ ریحانہ پیار سے اسے دیکھتی رہ گئی
اور وہ غسل خانے جا کر نہانے لگا۔

نہا کر تولیے سے سر رگڑتا ہوا وہ باہر نکلا تو ڈاکیہ آ گیا۔ آصفہ کا منی آرڈر تھا۔
[illegible]دے میں کھڑی عطیہ کو عظیم نے آواز دی۔
عطیہ! عاصفہ سے کہو اپنا منی آرڈر لے لے۔
عاصفہ نے شاید خود ہی سن لیا۔ بھاگتی ہوئی وہ وہاں آئی۔ جلدی جلدی دستخط
کئے اور منی آرڈر وصول کر لیا۔ ایک ہزار روپیہ تھا۔ عظیم جب وہاں سے مڑنے
لگا تو عاصفہ نے بڑی ہمدردی سے پوچھا۔
عظیم! تمہیں اگر روپوں کی ضرورت ہو تو لے لو۔
عظیم تیز تیز قدموں سے سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔
مہربانی!

یہ ایک فوجی بارک نما حویلی تھی جس کا آدھا حصہ عظیم اور آدھا حصہ اس کے
[illegible] سعادت کے پاس تھا۔ عظیم کے ابا انجینئر تھے اور چند برس قبل اچانک ایک
[illegible]دثے میں مر گئے تھے۔ عظیم اس وقت میٹرک میں تھا۔ وہ عظیم کو ڈاکٹر بنانا
[illegible]ہتے تھے۔ پر موت نے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔ اس کے بعد عظیم
[illegible]ے کسی نہ کسی طرح بی۔ اے کر لیا۔ اور اب ایک پرائیویٹ فرم میں وہ معمولی
[illegible]ک تھا۔

عظیم کے چچا سعادت ڈاکٹر تھے ایک خوش مزاج اور ہمدرد انسان تھے
[illegible]لی بیوی مر چکی تھی اور اولاد میں صرف ایک لڑکی ہی تھی جس کا نام آسیہ تھا اور
[illegible]الکڑی کے تیسرے سال میں تھی۔ گھر کے اخراجات اور چھوٹے بھائی کی

پڑھائی جاری رکھنے کے لیے عظیم کو سروس کے علاوہ پارٹ ٹائم جاب بھی کرنا
پڑ رہا تھا۔

کھانے کے بعد عظیم کچھ دیر ماں کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہا۔ اس دوران عظیم
نے اس کی پتلون قمیض اور کوٹ برش کر دیئے تھے۔ عظیم اٹھا اور کپڑے پہننے لگا
ریحانہ نے بڑی شفیق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

عظیم! میں تو کہتی ہوں یہ جز وقتی کام چھوڑ دو۔ صحت خراب ہو جائیگی بیٹے
دن رات کام میں جتے رہتے ہو۔

ماں کی طرف دیکھتے ہوئے عظیم نے بڑی سنجیدگی اور مغموم انداز میں کہا۔

گھر کے اخراجات چل جائیں گے کیا؟ میری ایک تنخواہ تو قیصر کی پڑھائی پر ہی لگ
جاتی ہے۔ پھر اس کی آواز گہری اور گھمبیر ہوگئی۔ آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں امی
اور پھر میری صحت میں کوئی فرق تو نہیں پڑا۔

ریحانہ لاجواب سی ہو کر خاموش ہوگئی۔ عظیم جب باہر نکلنے لگا تو ریحانہ تیزی
سے اٹھی اور دس روپے کے دو نوٹ اس کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا:
دن کام کرتے رہتے ہو کچھ کھا پی بھی لیا کرو۔

عظیم برآمدے سے اتر کر صحن میں ہوتا ہوا جب بیرونی دروازے کیطرف
بڑھ رہا تھا تو اس کے چچا سعادت نے اسے آواز دی۔ وہ اپنے مکان کے
لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ عظیم نے ان کی آواز نہ سنی تھی۔ اتنے میں
کی چچازاد بہن آسیہ بھاگتی ہوئی آئی اور زور سے پکارا۔

عظیم بھائی!

عظیم نے مڑ کر دیکھا ـــ مجھے بلایا آسیہ!

ہاں بھیا! ابو آپ کو بلا رہے ہیں۔

دونوں گھروں کے درمیان کوئی دیوار یا پردہ نہ تھا۔ عظیم وہیں سے مڑا اور
سعادت کے سامنے کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے
ہوئے سعادت مسکراتے ہوئے بولے۔

پارٹ ٹائم جا رہے ہو؟

جی ہاں۔ کوئی کام ہو تو کہیئے۔

کام تو کوئی نہیں۔ بس چائے تیار ہے پیتے جاؤ۔ اتنے میں آسیہ نے اس کے
سامنے دھواں نکلتی ہوئی چائے کی پیالی لا کر رکھ دی۔ عظیم خاموشی سے پینے لگا۔
پیالی خالی کر کے اس نے گھڑی دیکھی اور کھڑا ہوگیا۔

مجھے اب اجازت دیں انکل ـــ سعادت نے بڑی شفقت سے اس
کی طرف دیکھا مسکراتے اور گھلاوٹ آمیز لہجے میں کہا۔

جاؤ بیٹا! خدا تمہیں اپنی زندگی کے مقصد میں کامیاب کرے۔ عظیم وہاں
سے ہٹ کر باہر نکل گیا۔

تیس دسمبر کی وہ تاریک رات تھی۔ ہر طرف سرد اور ویران اندھیرا پھیلا ہوا
تھا۔ گہرے نیلے آسمان سے رات اوس کے موتی برسا رہی تھی۔ پرانا، کہن اور
بوڑھا سال اپنی آخری رات میں دم توڑ رہا تھا۔ اور نئے سال کا طفل اپناتے

آدم کے دکھوں میں اضافہ کرنے اور ان کے سروں پر پاؤں کوبی کرنے کے لیے اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھ رہا تھا۔

جز دفتی کام سے فارغ ہو کر عظیم سیٹی بجاتا ہوا اپنے گھر داخل ہوا۔ وہ گھر کے بڑے کمرے میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ رُک گیا۔ دائیں طرف کے تیسرے کمرے میں اسے کسی کے کھسر پھسر کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ قیصر کا کمرہ تھا عظیم اس دروازے پر آیا اور ایک روزن سے اندر جھانکا۔ اس کا جسم تھرا گیا۔ اس کا دل یوں دھڑک اُٹھا تھا جیسے کسی دیوانے کا ہاتھ اچانک مضراب پر گر گیا ہو۔ اس کا ذہن لاوے کی طرح کھول اُٹھا تھا۔ اس کی حالت اس لاش جیسی ہو گئی تھی۔ جسے چتا میں رکھ کر آگ لگا دی گئی ہو۔

اندر قیصر اور عاصفہ آمنے سامنے کرسیوں پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بڑی چاہت اور پیار سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر عظیم کے کانوں میں قیصر کی آواز پڑی۔

ہم دونوں کب تک یوں چوری چوری ملتے رہیں گے۔

عاصفہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تو پھر بات کرو خالہ سے۔

قیصر نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ـــــ توبہ! توبہ! میں امی سے کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ میں عاصفہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تو میرے کھڑے کھڑے گلا گھونٹ دینگی۔ وہ کوئی بھی ایسا کام نہیں کرتیں جس میں بھائی جان کی خوشنودی شامل

نہ ہو وہ بھائی جان سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتی ہیں۔

عاصفہ نے جستجو میں پوچھا۔

وہ عظیم کو اتنا کیوں چاہتی ہیں۔

ایک تو بڑا بیٹا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شکل ابو جان سے ملتی ہے بس سے بڑھ کر امی جان کو انکی عادات پسند ہیں کیونکہ امی کی اجازت کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کرتے۔

عاصفہ نے قیصر کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی میں کہا۔

دیکھو قیصر! جہاں تک عظیم کی ذات کا تعلق ہے۔ وہ دراز قد، خوبصورت اور شخصیت میں لاجواب ہے۔ جسمانی لحاظ سے وہ ہر طرح تم سے بالا تر اعلیٰ ہے۔ اور میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ میں اس سے۔ بے پناہ محبت کرتی رہی ہوں۔ لیکن یہاں اس کے پاس رہتے ہوئے ہم نے اس کی ایک خامی پکڑی ہے جس کی وجہ سے میں اس سے دُور ہٹ کر تمہارے قریب آئی ہوں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ کوئی کام اپنی امی کی رضامندی کے بغیر نہیں کرتا۔ کل کو میری اور اس کی اگر شادی ہوتی ہے تو وہ ساری باتیں تو خالہ کی مانے گا۔ ایسی حالت میں میری وقعت اس گھر میں ملازمہ سے زیادہ نہ ہو گی۔ یاد رکھو اگر تم نے بھی وہی راستہ اختیار کیا تو میں دوبارہ عظیم کی طرف لوٹ جاؤں گی۔

قیصر نے اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

شادی کے بعد میں ویسے ہی کیا کروں گا جس طرح تم کہو گی۔

تو پھر خالہ سے شادی کی بات کرو۔

یہ کام صرف تم ہی کر سکتی ہو۔

کیسے ؟

بس تم اپنی امی سے کہو میں عظیم سے نہیں قیصر سے شادی کرنا چاہتی ہوں وہ امی
سے بات کرینگی اور یوں بات بن جائیگی۔

عظیم اس سے آگے کچھ نہ سن سکا اس پر اعصاب شکنی طاری ہوگئی تھی۔ جان
پر آسمان پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس کا بھائی جو اس کی محنتوں کا ثمر
تھا اسے دھوکا دے رہا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے اس نے دیوار کا سہارا لے لیا اور
اُونچے اُونچے سانس لینے لگا۔ اسے عاصفہ سے محبت جو تھی۔ وہ دیوار سے سہارا
لیے کھڑا رہا صحن میں اوس سے لدا ہوا یوکلپٹس کا درخت رو رہا تھا۔ رات خاموش
ستارے اداس اور دیوار تک کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے جسم
کی ساری اکائیاں منتشر ہونے لگی تھیں۔ قسمت کے اس کھیل پر وہ خشک لکڑی کی طرح
ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی حالت ہزاروں سال پرانے مندر کے شکستہ استھان پہ بجھتے
ہوئے چراغ جیسی ہوگئی تھی۔

اس کا بھائی اس کی ودیعت اس سے چھین رہا تھا۔ وہ اس طوفان زدہ پرندے
کی مانند ہوگیا تھا جس کا آشیانہ تیز ہواؤں میں منتشر ہوگیا ہو۔ یا وہ اس شخص کی طرح تھا
جسے بے گناہ ہوتے ہوئے بھی دوزخ کے تاریک غاروں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔
اس کی زندگی کا یہ پہلا حادثہ تھا جس نے اسے خدا کا منکر اور ملحد بنانے کی اساس
ڈال دی تھی۔

کمرے کے اندر جب کھٹکا ہوا تو وہ سنبھل گیا۔ شاید عاصفہ باہر آنے لگی تھی۔
وہ گرتا پڑتا بائیں طرف مڑا اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ سامنے
عطیہ بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی اور اس کے بائیں ریحانہ صائمہ کو اپنی گود میں بٹھاتے
پڑھا رہی تھی۔

اتنے میں عظیم آگے بڑھا وہ تینوں چونک پڑیں۔ عظیم بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔
قدم رکھتا کہیں تھا اور پڑتے کہیں تھے۔ وہ ہانپ رہا تھا جیسے ایک لمبی مسافت
طے کر کے آیا ہو۔ بہک رہا تھا۔ نشہ کرنے والوں کی طرح۔

ریحانہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ صائمہ کو اس نے ایک طرف بٹھایا اور تیزی سے عظیم
کی طرف لپکی۔ عطیہ نے بھی کتاب پھینک دی اور پریشانی کی حالت میں عظیم کی طرف
بھاگی۔ ریحانہ نے آگے بڑھ کر عظیم کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور روتی ہوئی آواز میں پوچھا
کیا ہوا بیٹے!

عظیم ماں کے بازوؤں میں جھول گیا۔ اس کا سر ریحانہ کے سینے پر گر گیا تھا۔ عظیم
جس کا قد چھ فیٹ کے قریب تھا اور جسم خوب بھرا ہوا تھا۔ جب ریحانہ کے بازوؤں
میں جھول گیا تو اس بیچاری کی ٹانگیں کپکپا گئیں اور وہ رونے لگی۔ ریحانہ گو چار بچوں کی
ماں تھی لیکن جوان تھی۔ چھوٹی عمر میں ہی شادی ہوگئی تھی اور اگر اسے عظیم اور عطیہ کے
سامنے کھڑا کر دیا جائے۔ تو وہ کسی صورت ان کی ماں نہ لگتی تھی۔ اور دیکھنے والا یہی
کہے گا۔ ان کی بہن ہے۔ اس کے سر کا ایک بال بھی ابھی سفید نہ تھا۔ اور چہرے پر
وہی جوانی کی سُرخی اور تازگی تھی۔ اس کے باوجود وہ عظیم کے بوجھ تلے ڈگمگا گئی

تھی ——

عظیم کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے اور آنسو بہاتے ہوئے اس نے کہا ——

عظیم! کیا ہوا میرے بچے! ایسے بدھو سے تو ہو بیٹھے!

ریحانہ کی چھاتی پر سر رکھے عظیم نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

آپ کا بیٹا بک گیا ہے ماں! میں منتشر ہو گیا ہوں امی!

عطیہ جو ابھی تک بُت بنی کھڑی تھی۔ عظیم کی کمر سے لپٹ کر پھٹ پڑی اور بھیا بھیا پکارتی ہوئی دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ صائمہ بھی وہاں بیٹھے بیٹھے رونے لگی تھی۔

عظیم نے ایک بار اپنا چہرہ اُوپر اُٹھایا۔ اس کا منہ آنسوؤں میں دُھلا ہوا تھا اس کے چہرے پر جذباتی ہیجان اور مکمل بے اعتنائی، ناآسودگی اور لامحدود خاموشی کے آثار تھے۔ جیسے وجع القلب کا مریض ہو۔ وہ ویران، پامال، شکستہ اور خستہ حال تھا اس کے چہرے پر یاس و قنوط کی زردی بکھری ہوئی تھی۔ ریحانہ کو یوں لگا جیسے قدرت کی ساری تخلیقی قوتیں ختم ہو گئی ہوں اور اس کا اپنی جان سے عزیز بیٹا زمانے کی لامحدود وسعتوں میں تحلیل ہو کر لمحہ بہ لمحہ اس کی نگاہوں سے دُور ہوتا جا رہا ہو۔

ریحانہ اس کی حالت دیکھ کر پاگل ہو گئی اور اس کا منہ چومتے ہوئے پُوچھا۔

کیا ہو گیا میرے بچے کو؟ کس منحوس کی نظر لگ گئی ہے۔ وہ رو بھی رہی تھی اور عظیم کا منہ بھی چومتی جا رہی تھی —— عظیم نے ایک ہاتھ ریحانہ کی گردن کے گرد اور

دوسرا عطیہ کے گلے میں ڈال کر اس نے دونوں ماں بہن کو زور سے لپٹاتے ہوئے کچلے کچلے اور دبے دبے لہجے میں پُوچھا۔

کیا ہوا آپ دونوں کو میں تو —————— اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

عطیہ نے روتے روتے کہا۔

آپ کو کچھ ہو گیا ہے بھیّا! ہم دونوں ماں بیٹی تو دیکھو ٹھیک ہیں —— صائمہ ابھی تک بھیا بھیا کہتی ہوئی رو رہی تھی۔

اتنے میں قیصر اور عاصفہ بھاگتے ہوئے اندر آئے عطیہ نے قیصر کی طرف دیکھتے ہوئے اور زیادہ زور سے روتے ہوئے کہا۔

بھیّا دیکھو بھائی جان کو کیا ہو گیا ہے۔

عاصفہ عظیم کے قریب کھڑی ہو کر پریشانی سے یہ منظر دیکھنے لگی۔ قیصر آگے بڑھا اور عظیم سے لپٹ گیا۔

کیا ہوا بھیّا!

عظیم نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا —— کچھ نہیں۔

اسی وقت سعادت بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ سخت بدحواس تھے ان کے پیچھے پیچھے آسیہ بھی تھی۔ سعادت نے آتے ہی گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

بھابی! کیا بات ہے۔ تم لوگ رو کیوں رہے ہیں۔

ریحانہ اور زیادہ کھل کر رونے لگی۔

بھیا! عظیم کو دیکھیں کیا ہوا ہے — اسے کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی وہ بچاری پلنگ پر گر کر سر پیٹنے لگی۔ عطیہ اور صائمہ اسی طرح رو رہی تھیں۔ آسیہ نے آگے بڑھ کر ریحانہ کو سنبھالا۔

صبر کریں آنٹی۔ اپنے آپ کو سنبھالیں۔ کچھ نہیں ہوا بھائی جان کو۔ ٹھیک ہیں — ریحانہ کے پاس سے ہٹ کر آسیہ عظیم کی طرف بڑھی اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر اسے کے شانے دبانے لگی۔

سعادت نے سب کو پیچھے ہٹایا۔ عظیم کو انہوں نے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

کیا ہوا میرے بیٹے کو؟

عظیم کی آواز کپکپا رہی تھی۔ انکل! — وہ — وہ — دیکھیں نا

سعادت نے اس کی پیشانی پر پیار کیا — تمہیں یہ اچانک کیا ہو گیا ہے بیٹے۔

عظیم اب کچھ کچھ سنبھلنے لگا تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے بدن نے ایک جھرجھری لی اور وہ سنبھل گیا۔ اصل بات کو اس نے اپنے سینے میں لاوے کی طرح تپتا اور سلگتا ہوا راز ہی رہنے دیا اور فوراً بہانہ تراش لیا۔

انکل! میں گھر آ رہا تھا کہ سڑک پر ایک بچی ٹرک تلے آ کر مر گئی۔ وہ بالکل ہماری بے بی جیسی تھی۔ اس حادثے سے میرے حواس جاتے رہے اور میری یہ حالت ہو گئی — وہ رک گیا۔ سعادت نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

واہ بیٹے! اتنی سی بات تھی۔ ذرا ماں اور بہنوں کی حالت دیکھو رو رو کر پاگل

ہو رہی ہیں۔ عظیم ان کی طرف بڑھا وہ بیٹھی رو رہی تھی۔ عظیم نے اس کے گلے میں بازو ڈال دیے اور شاہانہ طفلانہ معصومیت سے کہا۔

امی کھانا دیں نا بھوک لگی ہے — عظیم کی اس حرکت پر سب مسکرانے لگے۔ ریحانہ نے آنسو بہاتی آنکھوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے عظیم کی طرف دیکھا پھر کھانا لانے باہر نکل گئی۔

عظیم نے پہلے عطیہ کو سنبھالا۔ پھر صائمہ کے پاس آیا جسے آسیہ نے اٹھا رکھا تھا عظیم نے صائمہ کو اٹھا لیا اور اسے لیکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ صائمہ نے اس کی چھاتی پہ سر رکھ دیا اور بھولے پن سے کہا۔

بھیا! تم رو کیوں رہے تھے؟

عظیم نے اس کے بال چوم لیے۔ میں تو ٹھیک ہوں بے بی۔ اس نے جیب سے چیونگم نکال کر بے بی کو دے دی اور وہ خاموش ہو گئی — ریحانہ کھانا لے آئی اور اس کے سامنے تپائی پر لگا دیا۔ کھانا کھانے کو اس کا جی نہ چاہ رہا تھا۔ تاہم ماں کا دل رکھنے کی خاطر وہ بیزاری سے لقمے توڑنے لگا۔ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ کمرے میں عظیم کے پاس صرف ریحانہ، عطیہ اور بے بی رہ گئے تھے۔

عظیم نے ماں کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ مگر وہ ابھی تک فکرمند تھی۔ اس کے دل میں ایک گرہ سی بندھ گئی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا۔ عظیم کے تراشے ہوئے جھوٹ سے وہ مطمئن نہیں ہے۔

رات حسب معمول بے بی عظیم کے پاس ہی سو گئی تھی۔ جبکہ عظیم بے چینی سے

کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کا ذہن چھوٹے بھائی کے منافقانہ اور رخناسانہ رویے میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی محبت کے سارے پختہ عہد ریت کے گھروندوں کی طرح اس پر گر کر بکھر گئے تھے۔ چھوٹا بھائی جسے وہ اپنا خون دیکر پال رہا تھا۔ اس کے لیے آستین کا سانپ جو بن گیا تھا۔ اور تقدیر کے اس بل نے اسے کانچ کے کھلونے کی طرح توڑ دیا تھا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ سب لوگ ناشتہ کر چکے تھے۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے ریحانہ نے اسے جگایا نہ تھا اور وہ عطیہ کے ساتھ گھر کے دھندوں میں لگ گئی تھی۔ عظیم جب کافی دیر تک نہ اٹھا تو ریحانہ اندر آئی۔ صائمہ جاگ رہی تھی اور عظیم کی قمیض کے بٹنوں سے کھیل رہی تھی۔ ریحانہ نے بڑے پیار سے عظیم کے گال کو ہاتھ رکھ کر اسے تھپتھپایا۔ اس کا دل دہل گیا۔ عظیم کا جسم گرم تھا اور بخار ہو گیا تھا۔ ریحانہ کا چہرہ اتر گیا۔ عظیم نے آنکھیں کھولیں اور ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ ریحانہ نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

عظیم! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

عظیم نے آہستہ آہستہ آنکھیں جھپکائیں۔

امی! ——— میں ——— مجھے ——— وہ کچھ کہہ نہ سکا اور ماں کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ آنسو پیتے ہوئے ریحانہ نے پوچھا

کسی نے تمہاری دل شکنی کی ہے بیٹے!

عظیم نے اپنا ایک بازو ماں کے گلے میں ڈال دیا۔

نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں۔

ریحانہ رو پڑی۔

پھر رات ہی رات میں تمہارا ذرا سا منہ کیوں نکل آیا ہے؟

عظیم اٹھ کر بیٹھ گیا ——— امی میں باہر دھوپ میں بیٹھوں گا۔

ریحانہ نے اس کے سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

پہلے میری بات کا جواب دو عظیم۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کس نے تمہیں دکھ دیا ہے۔ کون ہے وہ شقی جس نے میرے بیٹے کو ایسا چرکا لگایا ہے۔ میں تمہاری ماں ہوں بیٹے۔ مجھ سے تو پردہ نہ رکھو۔ بس ایک بار مجھے یہ بتا دو۔ تمہیں کیا ہوا ہے

عظیم ریحانہ کے گلے میں جھول گیا۔

کچھ بھی تو نہیں امی! آپ یونہی وہم کر رہی ہیں۔

اتنے میں عطیہ اندر آئی اور عظیم سے پوچھا۔ ناشتہ لاؤں بھائی جان!

عظیم چپ ہی رہا۔ لیکن ریحانہ نے عطیہ سے ناشتہ لانے کو کہہ دیا اور عطیہ باہر نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوٹی۔ اس کے ہاتھ میں چلمچی، دوسرے میں پانی کا لوٹا اور کندھے پر تولیہ تھا۔ عطیہ نے عظیم کا منہ ہاتھ دھلائے۔ عظیم تولیے سے ہاتھ منہ پونچھنے لگا اور عطیہ نے میز کھینچ کر اس کے سامنے ناشتہ لگا دیا۔

ریحانہ کی طرف دیکھتے ہی عظیم نے دکھتے لہجے میں کہا۔ دل نہیں کرتا ناشتے کو امی! ریحانہ نے جھک کر اس کی گردن چوم لی۔ کھا لو بیٹے۔ رات بھی تم نے کچھ نہ کھایا تھا وہ عظیم کے پاس بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے اسے کھلانے لگی۔

ناشتے کے بعد اس نے چائے پی اور اُٹھ کر باہر آ گیا۔ عطیہ نے یوکلپٹس ـ
تنے کے ساتھ دھوپ میں کرسی لگا دی اور وہ وہاں بیٹھ گیا۔ قیصر بھی وہاں بیٹھا ہوا
رہا تھا۔ عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھ لیا۔

اب کیسی طبیعت ہے بھائی جان۔

نیچی سی آواز میں اس نے جواب دیا ـــــ ٹھیک ہوں۔

اسی لمحہ باہر رکشہ رکنے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر اِن کے دیکھتے ہی دیکھتے
عاصفہ رکشے سے اُتر کر مکان میں داخل ہوئی وہ ایک ہاتھ میں پرس اور دوسرے
میں بڑا سا ایک بنڈل اٹھائے ہوئے تھی۔ شاید بازار سے لوٹ رہی تھی۔ پہلے وہ
اپنے کمرے میں گئی۔ پرس رکھ کر لوٹی۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا وہ بنڈل کھولا۔ پھر وہ لان
میں آئی اور کپڑے کے دو پیس اس بنڈل سے نکال کر اس نے قیصر کی گود میں
رکھ دیئے۔

یہ تمہاری پتلون اور شرٹ کا کپڑا ہے۔ سلا لینا۔ پھر وہ عظیم کے پاس آئی اور
ویسے ہی دو پیس اس نے عظیم کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

یہ آپ کے ہیں۔

عظیم نے فوراً کپڑے عاصفہ کو لوٹاتے ہوئے کہا۔

یہ بھی قیصر کو دے دو۔ اس نے بڑے دُکھ سے کہا تھا۔

عاصفہ نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھا ـــ کیوں؟

یہ کپڑے اب اسے ہی اچھے لگتے ہیں۔ اس کی آواز میں معاندانہ کنگ

تھی۔ عاصفہ پانی پانی ہو گئی۔ اس کا منہ بند ہو گیا تھا۔ شاید دل کا چور پکڑا گیا تھا۔
شرمندہ سی ہو کر وہ بولی۔

پر یہ کپڑے تو میں نے آپ کے لیے خریدے ہیں۔

ایک سخت جھٹکے کے ساتھ عظیم نے عاصفہ کے ہاتھ سے کپڑے چھین لیے۔
اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ چلتا وہ قیصر کے پاس آیا اور اپنے کپڑے بھی اس
کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

یہ بھی لے لو قیصر!

ریحانہ جو ابھی تک یہ سارا منظر خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ غصے میں چلاتی
ہوئی بولی یہ کپڑے تمہارے ہیں عظیم! قیصر نے اپنے لے تو لیے ہیں۔

عظیم پیچھے ہٹ گیا اور گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

میں نے کیا کرنے ہیں امی! یہ پڑھ رہا ہے اسے کپڑوں کی ضرورت ہے۔
میرے پاس پہلے ہی کافی کپڑے ہیں۔

ریحانہ نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔

عظیم! ادھر میرے پاس آؤ۔

عظیم آہستہ آہستہ چلتا ریحانہ کے پاس آیا اور گردن جھکا کر اس کے سامنے
کھڑا ہو گیا۔ قبل اس کے ریحانہ اسے اور ڈانٹتی اور خفا ہوتی، عظیم کی آنکھوں
سے دو آنسو نکل کر ریحانہ کے پاؤں پر گر گئے۔ وہ بیچاری تحلیل ہو کر رہ گئی اور سارا
غصہ عظیم کی حالت دیکھ کر پل بھر میں جاتا رہا۔

عظیم نے اپنے سر کو جھٹکا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں ذرا جاؤں گا۔ امی میں کپڑے بدل لوں۔ ریحانہ اپنی جگہ پر گم سم کھڑی رہی۔ عظیم کو روکنے کی جرات نہ ہو سکی۔ اور عظیم تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بات بات پر بہن بھائیوں میں بیٹھ کر قہقہے لگانے والا عظیم بُجھ سا گیا تھا اس جی شمع کی مانند جو کسی کو دیکھے بغیر اپنی ہی روح کو جلاتی بجھاتی رہتی ہے۔ اس نے پ سادھ لی تھی۔ تپتے اور تنہا صحرا کی طرح وہ نا امیدی، ژولیدہ حالی، وحشت سب زندگی اور قساوت کا شکار ہو گیا تھا۔ حالات نے اسے کچل کر بنجر زمین جھڑبیری کی تیلیوں سے بنے ہوئے اس قفس کی طرح اداس کر دیا تھا جس کے ر کوئی پرندہ و پنچھی رہ ہو۔ ذہنی مفلسی کے دباؤ تلے وہ اپنی ذات میں گم ہو کر رہ تھا۔ بالکل سمندر میں آزادانہ کف اڑاتی ہوئی ان موجوں کی طرح جو سمندر سے ر کر کنارے کی خشک ریت میں جذب ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنا وجود کھو چکی ں۔ صرف ماں اور عطیہ کا دل رکھنے کی خاطر وہ ان کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ تیں کر لیتا تھا۔ ورنہ اس نے اپنے آپ کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔

ریحانہ نے اسے بہت کریدا، عطیہ نے خوب جھنجھوڑا۔ سعادت اور آسیہ نے بھی خوب کھنگالہ پر اس نے کسی کے سامنے وہ راز نہ اگلا جو اسے زنگ اور گھن کی طرح چاٹنے لگ گیا تھا۔ بس اندر ہی اندر وہ تپتا، کڑھتا اور پھکتا رہا۔ اس کی صحت بھی اب گرتی جا رہی تھی۔ قیصر اور عاصفہ اس کے سامنے آتے ہوئے اب خوف کھانے لگے تھے۔

ایک روز وہ تھکا تھکا سا گھر داخل ہوا۔ اور اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر بوٹ اتارنے لگا۔ ریحانہ اور عطیہ دونوں اس کے سامنے صوفہ پر آکر بیٹھ گئیں اور بڑی حسرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ بوٹ اتار کر اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ اور چھت کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

ریحانہ بیتاب ہوکر اٹھی اور اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ دیا۔

خیریت تو ہے میرے بیٹے!

وہ سنبھل گیا — ٹھیک ہوں امی! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں! بیٹھ جائیے اس نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ریحانہ پریشان ہوگئی تھی۔ چپ چاپ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ عظیم نے اپنی کرسی آگے کھینچ لی۔

پاؤں اوپر کر لیجئے امی!

ریحانہ نے پاؤں اوپر کرتے ہوئے دل شکن آواز میں کہا — کوئی خبر سنانا بیٹے! ریحانہ رو پڑنے والی تھی۔

میں کراچی جانا چاہتا ہوں امی!

ریحانہ پگل گئی — کیوں؟

مجھے وہاں ایک اچھی سی سروس مل رہی ہے۔ محلے کا ایک اور لڑکا بھی جا رہا ہے اسے بھی وہاں سروس ملی ہے۔ میرا ارادہ ہے میں اس کے ساتھ ہی چلا جاؤں۔ اس کے وہاں کچھ دوست رہتے ہیں۔ اس طرح میں رہائش کی تلاش سے بچ جاؤں گا۔

ریحانہ نے اپنا فیصلہ دیا۔

نہیں بیٹے۔ یہی سروس ٹھیک ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے تو ہو نا۔

عظیم نے ریحانہ کے پاؤں پکڑ لیے۔

امی! کیا آپ میری بات نہ مانیں گی؟

ریحانہ نے سختی سے ڈانٹ دیا۔

تم کہیں نہیں جاؤ گے عظیم۔ یہ میرا حکم ہے۔ اس بدنصیب ماں کا حکم جس کا کہنا تم نے آج تک کبھی نہیں ٹالا۔ پھر ریحانہ کھل کر رو پڑی اور ہچکیوں میں کہا۔ اگر ہم سب سے اتنی ہی نفرت ہوگئی ہے تو سب کا گلہ گھونٹ دو اور جدھر جی چاہے نکل جاؤ۔

عظیم نے بڑے دکھ سے کہا۔

کیا آپ بھی میرا کہا نہ مانیں گی امی!

ریحانہ بیچاری چھلنی ہو رہی تھی۔ دکھتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

میں پہلے ہی تمہاری چپ اور اداسی سے جلی بیٹھی ہوں عظیم اب اور آگ نہ لگاؤ

عظیم نے ریحانہ کے پاؤں پر اپنا منہ رکھ دیا اور ماں کے پاؤں کے تلے اپنے ہونٹوں سے چومتے ہوئے کہا۔

مجھے اُمید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔

ریحانہ غصّے میں بل کھاتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے عظیم

عظیم بھی کھڑا ہوگیا اور سر جھکا کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

یہ جگت اور سنسار ہی ظالم ہے امی! کسی کا کوئی دوش نہیں۔ آپ کی آتما ٹھنڈی رہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں یہاں رہ کر موم بتی کی طرح پگھل پگھل کر جان دے دوں۔ اگر آپ پسند کرتی ہیں کہ میری روح کو میرے جسم سے نفرت ہو جائے اور میرے اجزائے ہستی بکھر جائیں تو یوں ہی سہی امی! میں سمجھونگا میں نے اپنی زندگی کے امتداد کو سمیٹ کر اپنا آپ اپنی ماں پر قربان کر دیا ہے امی! آپ کی خوشی میری قربانی مانگتی ہے تو خدا کی قسم آپ دیکھیں گی۔ میں اپنی ماں کی خوشنودی کے لیئے ثابت قدم رہوں گا۔

عطیہ اپنی جگہ پر بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ ریحانہ آگے بڑھی اور عظیم کو لپٹاتے ہوئے اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

جو تم کہو گے۔ وہی ہوگا۔ پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور سعادت کے ہاں داخل ہوئی وہ دونوں باپ بیٹی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ریحانہ اندر داخل ہوئی۔ سعادت کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

آئیے بھابی!

ریحانہ آگے بڑھ کر آسیہ کے پاس بیٹھ گئی اور گلوگیر لہجے میں کہا۔

ایک نئی مصیبت آن پڑی بھیا۔

سعادت گھبرا گئے۔ کیا ؟

عظیم کراچی جانا چاہتا ہے۔

کیوں ؟

کہتا ہے وہاں ایک اچھی سروس مل رہی ہے۔ پر میرا دل نہیں مانتا بھائی جان! وہ صرف یہاں سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کسی نے میرے بیٹے کو کچل کر رکھ دیا ہے۔

جانے دو بھابی! شاید ماحول بدلنے سے سنبھل جائے۔

ریحانہ رو پڑی ـــ کیسے جانے دو بھائی جان! یہاں تو میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ زبردستی کھانا کھلاتی ہوں۔ وہاں اکیلا ہوگا۔ کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ وہاں اپنے آپ کے خلاف اس نے کچھ کر لیا تو پھر کیا ہوگا۔ کیا میں پھر جی سکونگی۔ آپ جانتے ہیں۔ عظیم ہی میری زندگی، میری جان اور میری روح ہے۔

سعادت گہری سوچوں میں کھو گئے۔ پھر انہوں نے اپنا سر آہستہ آہستہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ تم اسے جانے دو بھابی! وہ ایک عقلمند اور سیانا لڑکا ہے وہ کوئی بھی غلط قدم نہ اٹھائیگا۔ میری نسبت تم اسے بہتر جانتی ہو۔ کیا تمہیں اس سے یہی اُمید ہے۔ ہاں دُکھ تو اس بات کا ہے۔ خبر نہیں کس نے اس کا دل دکھایا ہے بس کئی روز سے یہی سوچ رہا ہوں۔

ریحانہ نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت حساس لڑکا ہے۔ بھائی جان۔ کسی نے اسے بہت بڑا گھاؤ اور چرکا لگایا ہے۔ روز بروز بجھتا جا رہا ہے۔

اب اس سے نخشا فضول ہے۔ بھابی۔ تم جانے دو اسے۔ اور ہاں تم قیصر سے تو بات کرو۔ شاید عظیم کا اس سے ہی کوئی جھگڑا ہوا ہو۔ میں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں وہ عظیم سے دُور دُور رہتا ہے۔

ریحانہ بھل کھا کر کھڑی ہوئی۔ باہر نکلی اور تیز تیز چلتی ہوئی آندھی اور طوفان کی طرح وہ قیصر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ قیصر پڑھ رہا تھا۔ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گیا اور کھڑا ہو گیا۔

امی جان! خیریت ہے نا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ریحانہ نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تم نے عظیم سے کچھ کہا ہے؟ کیا تمہارا اس سے کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے؟

قیصر کانپ گیا۔ نہیں تو امی جان!

ریحانہ ساون بھادوں کے موسلا دار مینہ اور بادلوں کی طرح برس پڑی۔ پھر یہاں سے کیوں بھاگ رہا ہے۔ کیوں اسے ہم سب سے نفرت ہو گئی ہے۔ اس نے چپ کیوں سادھ لی ہے۔ وہ بجھ کیوں گیا ہے۔ وہ دن کو مجاہدہ اور رات بیداری کرنے والوں کی طرح اپنی ہی زندگی سے تھک کیوں چکا ہے۔ گھر بسرام اور ماں کی محبت کو کیوں لات مار رہا ہے۔ کیوں اس کی آنکھیں پتھرا گئی

کیوں اس کے چہرے پر وحشی جلال آگیا ہے۔ اور کس لیے وہ اپنی زندگی کی آخری سرحدوں کو بھاگنے لگا ہے۔

ریحانہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بات بات پر قہقہے لگانے والا میرا عظیم کہاں کھو گیا ہے۔

قیصر نے آگے بڑھ کر ماں کو سنبھال لیا۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ امی جان!

ریحانہ رو رہی تھی۔

تم عظیم سے بالکل بے تعلق ہو گئے ہو۔ اسے کسی نے کچل دیا ہے اور تم نے اس سے کبھی پوچھا نہیں۔ اس گھر کو سنبھالنے والا ہی ہل گیا ہے۔ اس گھر کے ستون کو ہی گھن لگ گیا ہے۔

آہ! اس گھر کے در و دیوار کی بنیادیں جواب دے رہی ہیں۔ کیا ہونے والا ہے۔ میرے اللہ خیریت رکھیو! قیصر ریحانہ کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑا تھا

ریحانہ جب دوسرے کمرے میں داخل ہوئی تو عظیم کھانا کھا چکا تھا اور عطیہ اس کے ہاتھ دھلا رہی تھی۔ قریب ہی صائمہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ریحانہ عظیم سے قریب ہوتی ہوئی بولی۔

تم ضرور کراچی جانا چاہتے ہو بیٹے!

عظیم کھڑا ہو گیا۔ میں نے آپ سے کبھی مذاق بھی کیا ہے امی!

کیا کیا ساتھ لیجاؤ گے؟

عظیم بھاگ کر ریحانہ سے لپٹ گیا۔ او میری اچھی امی!

ساتھ کیا کیا لیجاؤ گے ؟

بس ایک بستر اور زیادہ سے زیادہ دو چار جوڑے کپڑے۔

ریحانہ نے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں شکایت ہی شکایت اور شکوہ ہی شکوہ تھا۔ عظیم ماں کی جلتی ہوئی ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ریحانہ کچھ دیر تک کمرے کے اندر کھڑی رہی پھر وہ بھی عظیم کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئی۔

ریحانہ نے دیکھا عظیم دائیں طرف قیصر کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ریحانہ کو شبہ ہوا وہ بھی اس کمرے کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی اور دونوں بھائیوں کی بات چیت سننے لگی۔

عظیم کو اپنے کمرے میں دیکھتے ہی قیصر کھڑا ہو گیا۔ وہ رعشے کے مریض کی طرح سر سے پاؤں تک کانپ گیا تھا۔ عظیم اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر دروازے پر کھڑی ریحانہ کے کان میں عظیم کی آواز پڑی۔

بیٹھ جاؤ۔

قیصر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر کئی اجنبی رنگ تیزی سے آمد و رفت کر رہے تھے۔ عظیم کی سنجیدہ آواز پھر ابھری۔

میں کل کراچی جا رہا ہوں قیصر!

امی مجھے بتا چکی ہیں۔

میرے بعد امی، عطیہ اور بے بی کا خیال رکھنا۔ تمہیں پتہ ہے ہمارے سر

پر باپ کا سایہ نہیں ہے۔ ہم دونوں بھائی ہی ان تینوں کے لیے سب کچھ ہیں۔ میرے بعد امی کو محسوس نہ ہو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ یاد رکھو وہ ایک ایسی ماں ہیں جو بہت کم بیٹوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ میں مجبوری کے تحت کراچی جا رہا ہوں۔ ورنہ عظیم میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ اپنی امی کے قدموں سے دُور ہو۔ امی سے جُدا ہونے کے خیال سے میرے دل پر ابھی سے طوفان چل نکلے ہیں۔

بے بی بات بات پر ضد کرے گی۔ اس کا دل نہ دکھانا۔ عطیہ ہماری جوان بہن ہے۔ اس کی ہر بات ماننا۔ وہ ایک عقلمند اور سلجھی ہوئی بہن ہے۔ وہ کسی کو شکایت کا موقع ہی نہیں دیتی۔

میں ہر ماہ روپے بھیجا کروں گا۔ تم دل لگا کر پڑھنا۔ اب امی کی ساری اُمیدیں تم سے وابستہ ہیں۔ میں نے جو کچھ بننا تھا بن چکا ہوں۔ تم محنت کر کے اپنا مستقبل سنوار لو۔ آج جس شخص کے پاس چار پیسے نہ ہوں اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ میں تم میں سے کسی کو نہ بھولوں گا۔ میں جہاں بھی ہوں گا۔ مجھے یہ احساس ہو گا کہ میں ایک بیوہ ماں کا سہارا ہوں اور مجھے ایک جوان بہن اور بھائی کی شادی کرنا ہے۔

قیصر کا سر جھکا ہوا تھا۔ آپ فکر نہ کریں بھائی جان میں آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں گا۔ عظیم کھڑا ہو گیا اور قیصر کی پیٹھ تھپتھپائی۔

شاباش تم بہت اچھے بھائی ہو۔

پھر وہ دروازے کی طرف مڑھ گیا۔ پر ابھی دو قدم ہی بڑھا تھا کہ واپس مڑتا ہوا اس بار بڑی زہریلی آواز میں بولا۔

اور ہاں عاصفہ کا بھی خیال رکھنا۔

قیصر کو یوں محسوس ہوا جیسے عظیم نے اس کے منہ تھپڑ مار کر ڈھیروں کالک اس کے مُنہ پر مل دی ہو۔ عظیم تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازے پر ریحانہ کو کھڑے دیکھ کر عظیم چونک پڑا۔

امی! آپ یہاں؟

ریحانہ نے آگے بڑھ کر عظیم کی پیشانی چوم لی۔

میرے بیٹے! میرے بچے! تمہارا نام بھی عظیم ہے اور تم ہو بھی عظیم۔

دوسرے روز صبح ہی صبح عظیم کے جانے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ وہ صرف ایک بستر اور دو جوڑے کپڑے لیجانے پر بضد تھا۔ لیکن ریحانہ نے ڈانٹ ڈپٹ کر اس کے اٹیچی میں ڈھیروں کپڑے بھر دیتے تھے اور ساتھ ایک بستر بھی باندھ دیا تھا۔

سٹیشن پر کھڑے کھڑے ریحانہ کا دل رو رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس عظیم کو دیکھے جا رہی تھی جس نے تھوڑی دیر بعد اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا تھا عطیہ اور آسیہ کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ قیصر اور عاصفہ کے جذبات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بظاہر وہ دونوں نارمل دکھائی دے رہے تھے۔

جب گاڑی پلیٹ فارم پر آکھڑی ہوئی تو سعادت عظیم کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور بڑے پیار سے کہا۔

بیٹے! باہر جا کر یہ نہ بھولنا تم ایک بیوہ ماں کے سہارے ہو۔ وہ جس طرح

تمہیں بھجوا رہی ہے میں جانتا ہوں۔ اس بیچاری کا دل رو رہا ہے۔ جاتے ہی اپنی خیریت کا خط لکھنا اور یہ بھی اطلاع دینا کہ سروس ملی ہے یا نہیں۔ ہم سب تمہارے خط کا بڑی بیتابی سے انتظار کریں گے۔

عظیم کا سر جھک گیا اور غمزدہ آواز میں اُس نے کہا۔

آپ فکر نہ کریں انکل! میں باہر جا کر اپنی اوقات نہ بھولونگا۔ میں آپ میں سے کسی کو بھی مایوس نہ کرونگا۔

سعادت نے اسے گلے لگا لیا۔ تم بڑے اچھے بیٹے ہو۔ اب وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ سب سے مل لو۔ جب وہ علیحدہ ہوتے سعادت نے اپنی جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر عظیم کی جیب میں ڈال دیئے۔ یہ رکھ لو تمہارے کام آئینگے۔

عظیم نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

میرے پاس کافی روپے ہیں انکل۔ اس کے علاوہ تین سو روپیہ امی نے دے دیا ہے۔ آپ رہنے دیں۔ سعادت نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

اچھے بیٹے ضد نہیں کرتے۔ اب جاؤ امی سے ملو جا کر۔

عظیم ریحانہ کے پاس آیا۔ وہ بیچاری پاگلوں کی طرح اسے چومنے لگی۔ عظیم اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔

امی! میری بات سنئے!

ایک طرف ہٹ کر اس نے عاصفہ سے اپنی منگنی کی انگوٹھی اتاری اور ریحانہ کو تھماتے ہوئے کہا۔

یہ سنبھال کر رکھ لیں امی !

ریحانہ پریشان ہوگئی۔

یہ بُرا شگون ہے۔ بیٹے ! انگوٹھی پہنے رہو۔

نہیں امی ! باہر مجھ سے یہ گم ہو جائے گی۔

گم ہو جائے گی تو جہنم میں جائے میں اور بنوا دونگی اپنے بیٹے کو
عظیم نے ضد کرتے ہوتے کہا۔ آپ رکھ لیں نا امی !

ریحانہ نے چپ چاپ انگوٹھی اپنی مٹھی میں دبا لی۔ بیٹے کے جُدا ہونے
کے موقع پر وہ کوئی نئی بات کھڑی نہ کرنا چاہتی تھی۔ ریحانہ اسے لیکر اس جگہ آئی جہاں
عطیہ اور آسیہ کھڑی تھیں۔ عطیہ نے بے بی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا عظیم نے پہلے جی بھر کر
بے بی کو پیار کیا پھر اس نے عطیہ کے کان میں کہا۔

میرے بعد امی کا خیال رکھنا عطیہ ! یہی سمجھ کر کہ میرے بعد تم اِن کی بیٹی نہیں
ان کا عظیم ہو۔ عطیہ بچاری ہونٹ کاٹتی ہو رو پڑی تھی۔ ریحانہ اور آسیہ دونوں بہن
بھائی کو پریشانی سے دیکھ رہی تھیں۔ عظیم نے پھر عطیہ سے کہا۔

میرے خطوں کا جواب جلدی دینا۔ امی کو کبھی فرصت نہیں بھی ہوتی مگر تم
باقاعدگی سے خط لکھنا۔ بے بی کا بھی خیال رکھنا۔

عطیہ نے آنسو پونچھتے ہوتے کہا۔

آپ بے فکر رہیں بھیا ! آپ کی بہن آپ کو مایوس نہیں کریگی۔ جب تک
آپ ہمارے سر پر ہیں۔ ہمیں کوئی فکر نہیں۔

عظیم پیچھے ہٹا اور پیار سے آسیہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوتے کہا۔ اچھا آسی
خدا حافظ۔ آسیہ بچاری منہ سے تو کچھ نہ کہہ سکی صرف اپنے آنسو پونچھ کر رہ گئی۔ اس
کے بعد عظیم قیصر اور عاصفہ سے ملا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

سیٹیاں بجیں۔ گاڑی نے ہارن دیا اور روانہ ہوگئی۔ سب لوگ پلیٹ فارم پر
اداس کھڑے تھے۔ گاڑی جب نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی ریحانہ نے دونوں
ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوتے دُکھتے لہجے میں کہا۔

یا اللہ ! میرا بیٹا خیریت سے لوٹے۔ میرے بچے کی خیر ہو میرے مولیٰ۔ تو
ہی اس کا حامی و ناصر ہے۔ اسی طرح کی دُعائیں دیتی ہوئی ریحانہ سب کے ساتھ
پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی۔

عظیم تفتہ دل اور سوختہ جگر کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ اس کے سا
محلے کا ایک لڑکا جمیل بھی تھا جس کے کراچی میں کچھ جاننے والے تھے اور
بھی روزگار کی تلاش میں کراچی جا رہا تھا۔ عظیم نے بھی ماں سے جھوٹ کہا تھا۔ اس
کراچی میں کوئی سروس نہ ملی تھی۔ وہ صرف گھر کے زندہ اور صحرا و بیاباں جیسے ما
سے نکل بھاگا تھا۔

ٹرین روہڑی سٹیشن پر آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی جب پلیٹ فارم چھوڑ
لگی۔ عظیم کھڑکی میں بیٹھا بڑی اداسی سے فاصلوں کو سمٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ا
کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نوجوان اور حسین ترین قد آور لڑکی ایک ہاتھ میں فر
کا لفافہ تھامے آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی ٹرین کی طرف بھاگی۔

ٹرین اب سپیڈ پکڑ رہی تھی۔ پہیے تیزی سے کھڑکھڑانے لگے تھے۔ لڑکی

ٹرین کے پاس آئی تو گاڑی اس وقت اپنی رفتار کے اثر پذیر عمل میں تھی۔

اتفاق سے وہ لڑکی بھاگتی ٹرین کے اسی ڈبے کو ہاتھ ڈال سکی جس میں عظیم
بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں فروٹ کا لفافہ ہونے کے باعث وہ اپنا بدن سمیٹ
کر اپنے پاؤں فٹ بورڈ پر نہ جما سکی اور اس کے پاؤں پلیٹ فارم کے فرش پہ
بُری طرح گھسٹنے لگے۔ لڑکی نے ایک بھیانک چیخ ماری۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا فروٹ
کا لفافہ اس نے پھینک دیا اور دوسرا ہاتھ بھی اس نے گاڑی کے آہنی دستے
پر ڈال دیا تھا۔ اب وہ اس حالت میں تھی کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے
ٹرین کو پکڑ رکھا تھا اور اس کے دونوں پاؤں پلیٹ فارم پر بری طرح گھسٹتے
جا رہے تھے اور پھر چند ہی گز آگے پلیٹ فارم بھی ختم ہو رہا تھا۔

عظیم بھاگ کر اس کی طرف بڑھا تھا۔ پلیٹ فارم ختم ہو گیا اور عظیم نے آگے
بڑھ کر اس کی بغلوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر جب اُوپر کھینچا تو لڑکی نے اپنے دونوں
ہاتھ ٹرین کے دستے سے علیحدہ کر لیے۔ وہ بیچاری اپنے حواس میں نہ رہی تھی۔
اس کے ردعمل میں عظیم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ لڑکی کے ساتھ لہراتا ہوا
ٹرین سے باہر گر گیا۔ دونوں وہاں آ کر گرے تھے۔ جہاں مین لائن میں سے کوئٹہ جانے
والی لائن علیحدہ ہوتی ہے۔ دونوں لوہے کی پٹڑی پر گرے تھے۔ عظیم نیچے اور لڑکی
اس کے اُوپر تھی۔ عظیم کی کمر میں چوٹ آئی تھی تاہم لڑکی بچ گئی تھی۔

دونوں اُٹھ کھڑے ہوتے۔ عظیم اپنی کمر سہلانے لگا تھا اور وہ حسین لڑکی
اس کے سامنے کسی سراسیمہ مخلوق کی طرح کھڑی تھی۔ وہ اسے اس طرح ٹکٹکی

دیکھے جا رہی تھی جیسے کوئی ماورا اور نادیدہ ہستی کہکشاں کے جھروکوں میں بیٹھ
زمین کی چاہت میں آسمان سے ٹوٹ کر گرنے والے ان شہابِ ثاقب کو دیکھ
رہی ہو جو فضائے بسیط میں روشنی کی ایک لکیر بناتے چلے جاتے ہیں۔ ا
فطرت کا کوئی پرکشش حسین اور معصوم گیت لگ رہی تھی اور استعجاب وا
انداز میں عظیم کو بس دیکھے جا رہی تھی۔

عظیم کے دوست جمیل نے زنجیر کھینچ کر گاڑی روک دی تھی اور ریلوے
مرد عورتیں بھاگتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ لڑکی جو ابھی تک ٹک
باندھے عظیم کو دیکھے جا رہی تھی۔ سنبھلی اپنے آپ کو جیسے خوبصورت سرخ ہو
کو حرکت دی اور پہلی بار عظیم سے مخاطب ہوئی۔

آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا
یہ ایک ایسا احسان ہے جس کا شکریہ اور کفارہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔

عظیم نے اس کے تمتماتے ہوئے سرخ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے
میں آپ کو گاڑی سے گرتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا۔

بھانت بھانت کے لوگ گاڑی سے اتر کر ان کی احوال پرسی کرنے
تھے۔ جمیل بھی بھاگتا ہوا وہاں آیا تھا اور عظیم کو لپٹا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ریلوے
کا عملہ بھی موقع پر پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے عظیم کو ریلوے ہسپتال روہڑی میں
کی پیشکش کی پر اس نے کہا میں ٹھیک ہوں اور میرے کوئی چوٹ نہیں
گاڑی دوبارہ اپنی منزل کی طرف دوڑ پڑی تھی۔

حیدرآباد ریلوے سٹیشن پر جب گاڑی آکر رکی تو عظیم تھوڑی دیر تک کھڑکی
ے سر نکال کر پلیٹ فارم کو دیکھتا رہا۔ جمیل اس کے قریب بیٹھا سویا ہوا تھا۔
ہم اٹھ کر جب ٹرین سے باہر نکلنے لگا تو ایک بیرا کھانے کی ٹرے اٹھاتے
ں آیا اور ٹرے اور پانی کی بوتل عظیم کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔

آپ کا کھانا۔

عظیم نے اسے حیرت سے دیکھا۔

میں نے تو کھانا منگوایا ہی نہیں۔

بیرے نے ٹرین سے باہر پلیٹ فارم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ کھانا آپ کے لیے اس لڑکی نے بھیجا ہے۔

عظیم نے باہر دیکھا۔ پلیٹ فارم کے ستون کے پاس وہی لڑکی کھڑی تھی۔
سے عظیم نے بچایا تھا۔

وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے عظیم سے کھانا کھا لینے کی منت کر رہی تھی اور
ی حسین مورتی کی طرح کھڑی تھی۔ عظیم اسے اس حالت میں دیکھ کر مسکرا دیا اور
انا کھانے لگا۔ لڑکی کے چہرے پر طمانیت بکھر گئی تھی اور وہ اس رینڈیئر کی طرح
ارا ابھرتی ہوئی جسے برف زاروں میں کوئی خطرہ نہ ہو اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف
لی گئی تھی۔

کراچی ریلوے سٹیشن پر جب گاڑی رکی تو عظیم اپنے دوست جمیل کے
اتھ اپنا اٹیچی اور بستر اٹھاتے پلیٹ فارم سے باہر آیا وہ دونوں ابھی کسی

ٹیکسی رکشے کا جائزہ لے رہے تھے کہ وہی لڑکی عظیم کے قریب آئی اور اسے مخاطب
آپ کہاں جائیں گے ؟
عظیم نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ گلے میں سرخ رنگ کا چھوٹا سا چمڑے
کا خوبصورت بیگ ڈالے مجسمہ حسن بنی کھڑی تھی اور اس کے پیچھے ایک قلی
اس کا سامان اٹھاتے ہوتے تھا۔
عظیم تکلدر کے سے عالم میں کھوہ گیا۔ بدحواسی میں اس نے جمیل کی طرف اشا
کرتے ہوتے کہا۔
مجھے خود علم نہیں کہاں جانا ہے۔ یہ میرا دوست جمیل ہے اس کے یہا
کچھ رشتہ دار ہیں۔ ہمیں ان کے ہاں جانا ہے۔ جمیل بتاؤ ہمیں کہاں جانا۔
جمیل نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس لڑکی کی طرف بڑھا دیا جس پر ریلوے
کالونی کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ لڑکی نے اڈریس پڑھا اور حیرت سے کہا۔
اس پہ کوئی مکان یا کوارٹر نمبر نہیں لکھا گیا۔
جمیل نے افسردہ اور مغموم لہجے میں کہا۔
میری بہن! روشنیوں کے اس شہر میں وہ جھونپڑی میں رہتے ہیں ا
ہم دونوں کو بھی ان کے ساتھ اس سیلی زمین والی جھونپڑی میں رہنا ہے۔ لڑکی ا
ہوگئی۔ عظیم کے اور قریب ہوتے ہوتے اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔
میرا نام کمل ہے۔ آپ نے اپنا نام بتایا ہی نہیں ؟
میرا نام عظیم ہے۔

لڑکی نے سرگوشی کی۔ میں کل نو بجے کیماڑی میں اس جگہ آپ کا انتظار کرونگی جہاں
سے منوڑہ کو لانچیں جاتی ہیں۔
عظیم نے بڑی بے بسی سے کہا۔
میں کراچی پہلی بار آیا ہوں۔ میں نہیں جانتا کیماڑی کیا ہے۔
پھر میں آپ کے ساتھ چلونگی اور جہاں آپ نے رہنا ہے وہ جگہ دیکھ کر
کل میں خود آکر آپ کو لے جاؤنگی۔
ہاں یہ ہو سکتا ہے۔
تو پھر آیئے میرے ساتھ کمل نے اپنا عظیم اور جمیل کا سامان ایک ٹیکسی میں
رکھوایا اور انہیں ساتھ لیکر وہ ریلوے کالونی کی طرف روانہ ہوگئی۔ جمیل نے
دور ہی سے اسے وہ جھونپڑی دکھا دی جس میں انہیں جانا تھا اور کمل اسی ٹیکسی
میں واپس چلی گئی۔ عظیم اور جمیل اپنا سامان اٹھاتے اس جھونپڑی کے پاس آتے۔
لیکن وہاں آکر وہ پریشان ہوگئے۔ جھونپڑی کا دروازہ بند تھا اور باہر تالا لگا ہوا تھا۔
دونوں تھوڑی ہی دیر وہاں کھڑے ہونگے کہ ساتھ والی جھونپڑی سے ایک
آدمی نکلا اور جمیل بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ اس کا ماموں زاد عارف تھا جمیل
نے پہلے عظیم سے اس کا تعارف کرایا۔ عارف نے اس جھونپڑی کا تالا کھولا اور
دونوں کا سامان اندر لے گیا۔ نرسل کی جھونپڑی میں سامنے والی دیوار کے اندر
لکڑی کا ایک چھوٹا سا روشن دان تھا کچے فرش کو لیپ کر ہموار اور ستھرا کر دیا گیا
تھا۔ عارف نے جمیل کو مخاطب کر کے کہا۔

یہ جھونپڑی آپ تم دونوں کی ہے۔ میں اور میرا ساتھی جو اس وقت کام پر گیا
ہوا ہے۔ ساتھ والی جھونپڑی میں چلے گئے ہیں۔ اس جھونپڑی میں ہمارا ایک مزدور
ساتھی رہتا تھا جو کویت چلا گیا ہے۔ اور جاتے ہوتے جھونپڑی ہمیں دے گیا ہے
ہم دونوں فرش پر ہی سوتے ہیں اگر تمہیں چارپائی کی ضرورت ہو تو کل لا دونگا
اس کے علاوہ تم دونوں خوش قسمت بھی ہو اس لیے کہ تم دونوں کی سروس کا ایک
پٹرول پمپ پر بندوبست بھی ہو چکا ہے۔ اگر کل آرام کرنا چاہو تو کر لو۔ ویسے جب
تم دونوں چاہو، میں تمہیں وہاں لے جاکر تمہاری بات پکی کرا دونگا۔

عارف نے اس کی بات کاٹتے ہوتے کہا۔

ہم کل سے اپنے کام پر جائیں گے۔ ہم یہاں آرام کرنے نہیں محنت کرنے آئے
ہیں۔ پھر اس نے عظیم کی طرف اشارہ کرتے ہوتے کہا۔

میرا ساتھی بی۔ اے ہے کیا اس کے لیے کوئی اچھی سروس نہیں مل سکتی۔ میں
تو میٹرک ہوں۔ گاڑیوں میں پٹرول بھرتا رہوں گا۔ پھر اس نے آج تک ایسا کوئی کام
نہیں کیا۔ یہ اپنی امی کا بڑا لاڈلا بیٹا ہے اور چند مجبوریوں کے تحت ایک اچھی نوکری
چھوڑ کر یہاں آیا ہے۔

عارف نے اداس لہجے میں کہا۔

اچھی نوکری کے لیے کسی منسٹر کی سفارش چاہیئے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کیلئے
کوئی جز وقتی کام اور تلاش کریں گے۔ اب تم دونوں آرام کرو۔ میں تم دونوں کے
کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ عارف باہر نکل گیا۔ جمیل نے جھونپڑی کی صفائی

شروع کر دی۔ عظیم نے بھی اس کے ساتھ کام کرنا چاہا پر جمیل نے اسے منع کر دیا اور
یوں کراچی شہر میں داخل ہونے والے دو مسافروں نے اپنے بستر مٹی کے فرش پر لگا کر
اپنی نئی زندگی کی ابتدا کر دی تھی۔ عارف ان کے لیے کھانا لے آیا اور دونوں نے
مل کر کھا لیا۔

آسمان پر جب رات چھا گئی۔ وہ دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔
باہر سمندر کی طرف سے آنے والی سوندھی اور نمکین ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی نرسل
کی جھونپڑیوں سے ٹکریں مار رہی تھی۔ عظیم ٹکٹکی باندھے چھت کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی
آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شاید ماں بہنوں کی یادوں میں کھو گیا ہوگا یا سانپ
کی طرح ڈسنے والے بھائی کا رویہ ذہن میں خلجان پیدا کر گیا تھا۔ اتنے میں جمیل نے
اسے پکارا۔

عظیم بھائی!

عظیم نے بستر کی چادر سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا — ہوں —

سو گئے ہو؟

نہیں۔

پھر کوئی بات کرو۔ اپنے پرانے اور اچھے وقتوں کی — عظیم جب خاموش رہا
تو جمیل پھر بولا — کیا سوچ رہے ہو۔ میں جانتا ہوں تمہیں امی یاد آ رہی ہوگی۔ اس لیے
کہ تم کبھی گھر سے نہیں نکلے۔ پر یہاں تو میں ہی تمہارا بھائی ہوں اور ہم دونوں کو مل کر
حالات کی سرکش موجوں کے اندر اپنی زندگی کی ناؤ کو کھینا ہے۔ عظیم نے پھر اپنے

آنسو پونچھ لیے اور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوتے کہا۔

آب دگل کا یہ جہاں بھی کیسا ہے۔ کوئی روتا کوئی ہنستا ہے۔ اپنے تک دھوکہ دیے جاتے ہیں کوئی رسم انقطاع نہیں رہی۔ یہاں کوئی ماتمی سایوں میں اپنی شام کرتا ہے اور کوئی پہاڑی جھرنوں سے خوش کن گیتوں میں اپنی صبحوں کا استقبال کرتا ہے۔ کوئی بڑی ڈھٹائی کے ساتھ معاندانہ رویے کے ساتھ دوسروں کی دولیت اور امانت چھین لیتا ہے اور کوئی چار آنسو بہا کر خاموش ہو رہتا ہے۔ مجھے اس زندگی سے اس جہاں سے نفرت ہوتی جا رہی ہے جس میں نوچا ناچی ہے۔ دل شکن بے اعتنائی اور دکھوں کا صعود و نزول ہے —— پھر —— پھر عظیم غصے میں چلا اٹھا۔ یہاں —— یہاں رمیدگی ہے وحشت، جہنم کی کثافت، صدیوں کا بوجھ سمندروں کی کراہ ژولیدگی قنوطیت اور شقاوت ہے۔ میں بھی ان مسافروں سے ایک ہوں جو عوطف داسیال کی تلاش میں لاہور سے کراچی آنے پر مجبور ہوتے ہیں ——

جمیل نے دکھ سے کہا۔

خدا تمہاری راہنمائی کریگا۔

عظیم نے خفگی کا اظہار کرتے ہوتے کہا۔

خدا بھی ہم جیسے لوگوں کو ظلمت کے اعماق میں گرتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے وہ بھی ان کی مدد اور راہنمائی کرتا ہے جو پہلے سے خوش اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔ ہم جیسوں کو وہ نظر انداز ہی کرتا ہے۔ تم جانو خدا کی طرح اس کی فطرت کے عناصر بھی

اسی جیسے رویے پر عمل کر رہے ہیں۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے۔ بارش وہیں ہوتی ہے جہاں پہلے سے نمی ہو۔ جلتے، تپتے، پھکتے اور پیاسے صحراؤں میں کیوں کالے سیام بادل نہیں برستے۔ ہم جیسے پیاسے اور تشنہ لوگوں کی طرح خدا ان صحراؤں کو بھی نظر انداز کرتا ہے۔ جیسے —— جیسے وہ اس کی اپنی تخلیق نہ ہوں۔ اور شیطانی قوتوں نے انہیں وجود بخشا ہو۔ جمیل خاموش رہا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔



عظیم کی جھونپڑی کے سامنے صبح نو بجے ایک رکشہ رکا اور کمل اس میں سے باہر نکلی۔ اس نے دیکھا جھونپڑی کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اداس ہوگئی وہ مڑ کر رکشے میں بیٹھنا چاہتی تھی کہ ساتھ والی جھونپڑی سے عارف کا ساتھی نکلا اور اس سے قریب آتے ہوتے پوچھ لیا۔

آپ کس سے ملیں گی؟

کمل نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوتے کہا۔

اس جھونپڑی والے کہاں گئے ہیں۔

ہم دونوں نے ان کے لیے نرسری کے ایک پیٹرول پمپ پر سروس کا انتظام کر رکھا تھا اور وہ آج ہی اپنے کام پر گئے ہیں کیا آپ ان دونوں میں سے کسی کو جانتی ہیں۔

کمل نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ان میں سے عظیم میرا رشتہ دار ہے وہ جب آئے تو اسے کہئے گا۔ کمل آئی تھی۔ شام کو میں دوبارہ آؤں گی۔ وہ رکشے میں بیٹھی اور چلی گئی۔

شام کو جب وہ دوبارہ آئی تو جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا وہ ہچکچاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ جھونپڑی کے اندر چھوٹے سے صحن میں جمیل تیل کے چولہے پر ہانڈی پکا رہا تھا اور اس سے قریب ہی عظیم پانی کی بالٹی اپنے پاس رکھے تانب چینی کی پلیٹیں دھو رہا تھا۔ شاید وہ بازار سے سارا سامان خرید لاتے تھے اور گھر پر کھانا تیار کرنے کا بندوبست کر لیا تھا۔

کمل کو دیکھتے ہی جمیل کھڑا ہوگیا اور بڑی شفقت سے بولا آؤ میری بہن!

کمل تیزی سے عظیم کی طرف بڑھی اور اس کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

لایئے میں ساری پلیٹیں دھو دیتی ہوں ——— عظیم نے بڑی انکساری سے جواب دیا۔

میں دھو لیتا ہوں۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔

کمل نے زبردستی اس کے سامنے رکھی پلیٹیں اٹھا لیں اور دھیمی سی آواز میں کہا میرے ہوتے ہوتے آپ ایسے کام نہیں کر سکتے۔ جمیل بھی ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

تم رہنے دو میری بہن! میں خود دھولونگا۔

کمل نے آہستگی سے کہہ دیا ——— میں دھو لیتی ہوں جمیل بھائی!

جمیل نے جلدی جلدی ہانڈی اتار کر چولہا بجھایا اور رومال لیکر باہر نکلتا ہوا

بولا۔ میں تنور سے روٹی لے آؤں۔ شاید وہ عظیم اور کمل کو آپس میں بات کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ جمیل کے باہر نکلتے ہی کمل نے بڑے پیار سے پوچھا۔

آپ صبح کہاں چلے گئے تھے۔ میں آئی تھی۔ جھونپڑی کو تالا پڑا تھا۔

کام پر چلا گیا تھا۔ مجھے سروس مل گئی ہے۔

کہاں ؟

ایک پٹرول پمپ پر۔

آپ پڑھے لکھے بھی ہیں نا ؟

بی ۔ اے ہوں۔

پھر کوئی اچھی سروس کی ہوتی۔ دن بھر پٹرول پمپ پر گاڑیوں میں پٹرول بھرنے کی کیا تک ہوئی۔

شکر کرو یہ بھی مل گئی ہے۔ ورنہ گھر سے چلتے وقت میں یہ اُمید لیکر گاڑی میں بیٹھا تھا کہ کراچی میں مجھے عام مزدوروں کی طرح سیمنٹ بجری کا کام کرنا پڑے گا۔ میں چند مجبوریوں کے تحت لاہور سے کراچی آیا ہوں۔

کمل نے پیار سے عظیم کی طرف دیکھا۔

کیسی مجبوریاں ؟

اداس لہجے میں عظیم نے کہا۔ میں ایک ایسا انسان ہوں جس کا کوئی ماضی اور مستقبل نہیں۔ شاید میں اسے یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی میرا ماضی اور موت میرا مستقبل ہوتی۔ میں اپنے آپ کو کھو چکا ہوں اور اپنی گم گشتہ ذات کو جس کی کوئی

پہچان نہیں ہے اس سیپ کی طرح تلاش کرتا پھر رہا ہوں جسے اپنے کھوتے ہوتے موتی کی تلاش ہو۔ میں روشنی کے گیتوں کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ اگر اپنے مقصد میں کامیاب رہا تو شاید کچھ عرصہ اور زندہ رہ سکوں۔ ورنہ میری روح تکان کے باعث حلول کر جائے گی۔

کمل کے پکے ہوئے اناس جیسے چہرے پر مردنی چھا گئی ۔ میں آپ کی ان باتوں کو سمجھی نہیں۔ کھل کر بتائیں کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ۔ عظیم نے اپنے اُوپر ڈھائے گئے اپنے بھائی کے ظلم کی داستان کہنا شروع کر دی۔ عظیم اسے اپنی بے بسی کی کہانی سناتا رہا اور کمل اس کے سامنے بیٹھ کر روتی رہی۔ اس کے لہجے میں تمرد، سرکشی اور بغاوت اتر آئی تھی وہ کسی لپنہارے کی طرح تھکا تھکا لگ رہا تھا اور اس کی زبان بار بار غوطے کھا رہی تھی۔ کمل کی حالت ایسی تھی جیسے تیز طوفانوں میں کسی درخت کی نازک ٹہنی ٹوٹ گئی ہو۔

عظیم جب خاموش ہوا تو کمل نے اس کا ہاتھ اپنے نازک سرخ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

آج سے آپ میرا تن من، جسم و جان اور میری روح و قالب ہیں۔ عظیم نے پرتاثیر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کمل! محبت کی رات جیسی اتھاہ تاریکیوں میں کھو جانے سے قبل یہ سوچ رکھو کیا آنے والے دنوں میں دو اجنبی مسافروں کی طرح ہماری راہیں الگ تو نہ ہو جائیں گی اگر ایسا ہو گیا تو پھر یہ میری زندگی کا آخری حادثہ ہو گا۔

کمل نے پیار کی گہری نگاہوں سے عظیم کی طرف دیکھا۔ پھر شاید کوئی فیصلہ کیا اور وہ سختی کے ساتھ اس طرح عظیم سے لپٹ گئی جس طرح بے چین اور طراز ندی سمندر سے بغلگیر ہوتی ہے ـــ میں آپ کو اپنی زندگی کا ساتھی چن چکی ہوں اور پوری زندگی آپ کا ساتھ دونگی۔ کمل اس سمے عظیم کی چھاتی سے لگی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ تروتازہ پھول ہو جو پوری رات شبنم میں نہاتا رہا ہو۔

عظیم نے لرزاں اور پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

کمل! تمہارے دل سے اٹھتی ہوئی محبت کی شعاعیں جنہوں نے تمہارے رخساروں کو تابناک بنا دیا ہے ان کا جواب میں بھی مثبت انداز میں دونگا۔

جھونپڑی کے دروازے پر کھٹکا ہوا تو دونوں علیحدہ ہو گئے۔ جمیل روٹیاں لیکر لوٹا تھا۔ وہ صحن سے گزر کر سیدھا اندر چلا گیا جھونپڑی کے فرش پر ایک بہت بڑی چٹائی بچھائی گئی تھی جس پر ذرا فاصلہ رکھ کر دو لبستر لگے تھے اور درمیان میں کچھ جگہ خالی تھی۔ جمیل نے اس درمیانی جگہ میں کھانے کے برتن لگاتے پھر دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی ـــ آؤ کھانا کھاؤ!

عظیم نے کمل سے کہا۔

چلو کھانا کھائیں ـــ کمل نے مسکرا کر کہا۔ مجھے بھوک نہیں کھالیں جاکر مجھے اجازت دیں۔ میں اب جاتی ہوں۔ اتوار کو صبح ہی صبح آؤنگی اور آپ کو شہر میں گھماؤنگی

کمل جھونپڑی سے باہر نکل گئی اور عظیم اندر جاکر کھانا کھانے لگا۔

ایک روز عظیم لولوگراؤنڈ کے پاس سے گزرتا ہوا ریلوے کالونی کی طرف جا رہا

ا کہ اس نے دیکھا سڑک کنارے ایک موٹر سائیکل گرا پڑا تھا اور بوڑھا سا ایک آدمی

ر لباس اور وضع قطع سے کوئی باحیثیت انسان لگتا تھا پولوگراؤنڈ کے اندر زمین پر

بے سدھ سا پڑا تھا۔ عظیم نے اس کے بوٹ جرابیں اتاریں اور کچھ دیر تک وہ اس

کے پاؤں رگڑتا رہا پر وہ بوڑھا آدمی ہوش میں نہ آیا۔ عظیم نے اس کے چہرے کا

جائزہ لیا۔ سردی کے باوجود اس کا چہرہ تپ رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں

ٹپک رہی تھیں۔ بوڑھے کے دونوں ہاتھ بڑے کرب کے انداز میں دل پر اس طرح

رکھے تھے جیسے اس نے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو تھام رکھا ہو۔

عظیم نے اس کے دونوں ہاتھ ہٹاتے اور اس کے دل کی جگہ کو آہستہ آہستہ

رگڑنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس بوڑھے نے آنکھیں کھولیں۔ پریشانی کے عالم میں پہلے

اپنے چاروں طرف اس نے نگاہ دوڑائی۔ پھر اس کی نگاہیں عظیم پر مرکوز ہو گئیں اور بڑی

بڑی شفقت سے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

تم کون ہو بیٹے!

عظیم نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ـــ میں ایک ایسا انسان ہوں جو

دوسرے انسان کو تکلیف اور دکھ میں دیکھ کر رک گیا ہے۔ میرا نام عظیم ہے۔

بوڑھے نے مردہ سی آواز میں کہا۔ شاید تم اس بیسویں صدی کے بہترین سپوتوں

میں سے ہو۔ میری گاڑی بھی شاید تمہیں نے اٹھائی ہے۔

جی ہاں ـ پر آپ کو ہوا کیا۔

بوڑھے نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میرا نام فرانسس ہے۔ دل کا مریض ہوں بیٹے۔ آفس سے لوٹ رہا تھا کہ
دل کا اٹیک ہوگیا۔ گاڑی سے گر پڑا اور یہ حالت ہوگئی۔

آپ کس آفس میں کام کرتے ہیں؟

پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی بلڈنگ میں بنک آف بہاولپور کے ہیڈ آفس میں اکاؤنٹنٹ ہ

علیم نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اسے موٹر سائیکل کے پاس لاکر پچھلی
پر بٹھایا اور خود وہ موٹر سائیکل وہاں سے نکال کر میکلوڈ روڈ پر لایا۔ ایک کیفے
سامنے وہ رکا۔ فرانسس کو سہارا دے کر وہ اندر لے گیا۔ پہلے ٹائلٹ میں اس
ہاتھ دھلایا۔ اور پانی کا ایک ٹھنڈا گلاس اسے پلانے کے بعد علیم نے چ
منگوائی اور دونوں بیٹھ کر پینے لگے۔

فرانسس نے علیم کے سراپا کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا — تم کہاں
ہو بیٹے!

میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ چند روز ہی ہوتے لاہور سے وارد ہوا ہوں
کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور فی الحال ایک پٹرول پمپ پر سروس مل گئی ہے۔

فرانسس نے قدرے چونکتے ہوئے پوچھا۔

تمہاری تعلیم کیا ہے؟

بی۔ اے فسٹ کلاس ہوں۔

فرانسس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر علیم کو تھماتے ہوئے کہا۔ کل
آفس آؤ میں تمہیں کلرک کی جاب دلا دونگا۔ آجکل کچھ وکنسیاں بھی ہیں۔ ضرور

کام کرتے مجھے اطمینان وسکون قلب ہوگا۔

علیم کھڑا ہوگیا۔ آپ اب چلے جائیں گے۔ یا میں چھوڑ آؤں۔ تمہارا شکریہ بیٹے۔
میں اب ٹھیک ہوں۔ دونوں کیفے سے نکل کر اپنی اپنی سمت چلے گئے۔

دوسرے روز پٹرول پمپ جانے کے بجائے۔ علیم فرانسس کے پاس اس کے
آفس چلا گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا اور استقراری آفیسر سے مل کر اس نے علیم کو تقرری
کا لیٹر اشو کرا دیا۔ اگلے روز سے علیم فرانسس کے ساتھ بنک میں بحیثیت کلرک کام
کرنے لگا تھا۔



اتوار نو بجے کے قریب کمل طوفان کی طرح جھونپڑی میں داخل ہوئی جلدی جـ
غلیم کی تیاری کرائی اور اسے ساتھ لیکر باہر نکل گئی۔ میکلوڈ روڈ آکر انہوں نے رکشـ
دونوں یزنوید ٹاور اور کیماڑی سے ہوتے ہوئے بندرگاہ میں اس جگہ آئے جہاں
منوڑہ کو لانچیں جاتی ہیں۔ راستے میں کمل اسے سڑکوں اور معروف جگہوں کے
بتاتی رہی تھی۔

کمل جب لانچ میں بیٹھنے لگی تو غلیم نے پریشانی میں پوچھا کہاں جا رہی ہو
کمل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ بس آپ خاموشی سے بـ
ساتھ چلے آئیے۔

لانچ سے دونوں منوڑہ آئے۔ اتوار ہونے کے باعث جزیرے میں تفریـ
آنے والے لوگوں کا خوب رش تھا۔ کچھ دیر تک دونوں پاؤں سے جوتے اتار کر سـ

گیلی ریت پر چلتے رہے۔ پھر دونوں نے ایک ساتھ اونٹ کی سواری کی۔ دوپہر تک وہ
ساحل پر گھومتے رہے پھر ایک کیفے سے کھانا کھا کر وہ ساحل سمندر کی کالی سیاہ اور سنگلاخ
چٹانوں کے اوپر جا کر بیٹھ گئے۔

غلیم کچھ دیر تک اپنے سامنے بیٹھی ہوئی کمل کو دیکھتا رہا۔ گوری چٹی قد آور تیکھے
نقوش اور گداز جسم والی وہ لڑکی اس سمے اسے یوں دکھائی دی تھی جیسے حسن اور شباب
کی امنگوں کا کوئی سرمدی وجود رکھنے والا اُبلتا ہوا چشمہ ہو۔ اس کے جسم سے ہلکی ہلکی سوندھی
مہک اُٹھ رہی تھی وہ وتنا گری کے اس پھول کی طرح تھی جو پوری طرح کھل کر ہواؤں
میں اپنی خوشبو بکھیر کر اپنے واصل کا انتظار کر رہا ہو۔

غلیم نے اسے مخاطب کیا۔ کمل! تم نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا کہاں رہتی ہو کیا
کرتی ہو اور ٹرین میں حادثے کے روز تم کہاں سے آ رہی تھی۔

کمل نے صحراؤں اور بیابانوں میں آزادی اور بے فکری کے قہقہے لگانے والی
چاندنی کی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم لوگ کیماڑی میں رہتے ہیں۔ حادثے والے روز میں لاہور میں ہونے والی
ایک اسکاؤٹ ریلی میں حصہ لیکر لوٹ رہی تھی۔ میں ایک مقامی کالج میں بی۔ اے
کے آخری سال کی طالبہ ہوں۔ ہم لوگ کرسچین ہیں اور گھر کے تین افراد ہیں۔ میرے ابو
ں اور میری چھوٹی بہن جس کا نام سیبل ہے۔ میری ماں سری لنکا کی رہنے والی ایک
بہٹ تھی۔ چند برس قبل اس کی ملاقات ایک مقامی مسلمان سے ہوئی۔
دونوں کے تعلقات بڑھے اور پھر وہ پلید انسان ایک روز میری ممی کو بہلا پھسلا

کراغوا کرکے لے گیا۔ اس طرح ہم دونوں بہنیں اپنے باپ کے پاس تنہا رہ گئیں۔ میرے
ابو قیام پاکستان کے وقت ضلع ہوشیار پور کی تحصیل گڑھ شنکر سے ہجرت کرکے آتے تھے
یہاں آکر وہ اپنے نام کوئی مکان الاٹ کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے اور آج تک ہم کرائے
کے مکانوں میں گزر بسر کرتے آرہے ہیں۔ بس یہ ہے۔ میری داستان۔ کمل خاموش ہوگئی۔
غلیم ویران و ملول بھری نظروں سے کمل کی طرف دیکھنے لگا۔ کمل نے گھبرا کر اس کا بازو
پکڑ کر جھنجھوڑا۔ آپ کہاں کھو گئے ہیں۔
غلیم نے غوطے کھاتی آواز میں کہا۔
کمل!
ہوں!
تمہاری ماں کو ورغلانے والا غیر کرسچین تھا نا!
ہاں!
تمہارے ابو کو ایسے لوگوں سے نفرت نہ ہو گئی ہوگی۔ جبکہ میں بھی غیر کرسچین ہو
کیا وہ پسند کریں گے کہ ان کی بیٹی کسی غیر کرسچین سے محبت کرکے اسے اپنی زندگی ا
جیون کا ساتھی چن لے۔
کمل نے اداس اور مغموم لہجے میں کہا۔
میرے ابو مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں میں انہیں اس پر آمادہ کر لونگی
وہ آپ کو میرا ہمسفر مان لیں۔
اگر وہ رضامند نہ ہوتے تب؟

آپ اتنے فاصلوں اور بعد کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ غلیم چند لمحوں تک پر سکوت
، کے بعد ملول لہجے میں بولا۔
آج کے بعد مجھ سے نہ ملا کرنا کمل!
کمل کا جسم کپکپا گیا اور چونکتے ہوتے اس نے کہا۔
کیوں؟ —— میں آپ کی پوجا کرتی ہوں۔ کیا آپ کو مجھ سے پریم نہیں آپ
ل کر مجھے شانتی اور میری روح کو چین و سکون ملتا ہے۔
پرتم سے ملتے ہوئے اب میری روح کی شانتی جاتی رہے گی۔ کیونکہ میرے
ں اب یہ بات پیوست اور استوار ہو جائے گی کہ ہم دونوں ایک ہو کر شادی نہیں
تے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ تمہارے ابو تمہاری بات مان جائیں۔ اور قبل اس کے ہم
ہیں اس قدر دور نکل جائیں کہ حالات کی مخالفت کے باعث وقت کی دھول
صلوں کی زنجیروں میں اُلجھ جائیں۔ ہمیں ابھی سے۔ علیحدہ ہو جانا چاہیئے کہ
ک ہم ابتدائی مراحل میں ہیں۔
مل پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اس کی حالت اس اندھی شمع
ی جو ہوا کے تیز جھکڑوں میں جل بجھی ہو۔ اور وہ بڑی حسرت سے غلیم کو دیکھے
ہی تھی۔
ونوں ایک دوسرے کے سامنے چپ اور اداس بیٹھے تھے۔ ان کے قریب
مدر سرگوشیاں کرتا ہوا کراہ رہا تھا۔ سمندری لہریں چٹانوں سے سر ٹکرا رہی
ان جانے دیسوں سے آتی ہوئی سمندری ہوا میں کچے ناریل کی سی خوشبو

رچی بسی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ جیسے وہ کوئی ناطق وجود نہ رکھتے ہوں
مجسمے ہوں جو جزیرہ کی ان چٹانوں پر ایستادہ کر دیئے گئے ہوں۔ جزیرے
لمبے لمبے ناریل کے درختوں سے نمکین بحری ہوائیں ٹکرا کر جنگلی گیتوں کی صد
پیدا کر رہی تھیں۔

کمل بنجر زمین کی طرح ویران اور سردیوں کے تنہا پہاڑی پھول کی طرح ا
ہوگئی تھی۔ اس کی حالت ان لہروں جیسی ہوگئی تھی جو سمندر سے بچھڑ کر ساحل
ریت میں جذب ہو رہی ہوں۔ دو محبت کرنے والے وصال اور جدائی کے
کھڑے تھے۔ اپنے دل میں کچھ غیر متشکل جذبے لیے وہ قریب و بعید کا امتیاز
کر کسی پنہاں راز کی ابدیت میں کھو گئے تھے اور ان کے قریب بے رحم
ہوا سمندر اپنی بھیانک آوازوں میں اونگھ رہا تھا اور شیطان کی طرح سیاہ چٹ
ہروں سے گلے مل کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ وحشی اور ہیبتناک قہقہے۔

کمل کی آواز یوں بلند ہوتی۔ جیسے کسی زخمی کی کراہ یا مرنے والے کی
کرب میں ڈوبی ہوئی کوئی صدا ہو۔ اس نے عظیم سے پوچھا۔

کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے۔

عظیم کی لرزتی آواز سنائی ہے۔

کمل! میرے دل میں تمہارے لیے ایک جذبہ ضرور ہے جسے تم ہم
انس اور محبت یا ایسے ہی کسی اور لفظ کا نام دے سکتی ہو۔

کیا محبت جو روح کی گہرائیوں کے ایک لطیف جذبے کا نام ہے!

کے مادی ترازوں سے ناپا جا سکتا ہے۔

نہیں۔

پھر آپ یوں بے رحمی کے ساتھ مجھ سے کیوں رو گردانی کر رہے ہیں۔ کمل کی آنکھوں
سے آنسو نکل کر اس کے سرخ چکنے رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔

عظیم کی روتی ہوئی سی آواز ابھری۔ کمل تمہیں میرے حالات کا علم ہے میں ایسا
برگشتہ بخت، پریشان و مجبوب انسان ہوں جسے اس کے بھائی نے زہریلے سانپ
کی طرح ڈس لیا ہے۔ میں ایک ایسا مسافر ہوں جس کے پاس تنکا تک نہیں رہ گیا۔
میں تمہاری محبت میں ابھی زیادہ دور نہیں جانا چاہتا۔ کل کو اگر تمہیں بھی مجھ سے چھین
لیا گیا تو میری روح کو میرے جسم سے نفرت ہو جائے گی اور میں زندہ نہ رہ سکونگا۔ کمل!
میں اپنے آپ کو بار بار دھوکہ نہیں دے سکتا۔ مجھ میں اب کاغذی محل اور ریت کے
گھروندے تعمیر کرنے کی سکت نہیں رہی۔ اپنی زندگی کی کتاب میں کوئی حسین اور دلکش
نقش بنانے سے قبل مجھے یہ سوچنا ہوگا کہ میری زیست کی ٹہنی پر کانٹے ہی کانٹے ہیں۔
اور کیا ان سے الجھ کر میرا دامن پھر تار تار تو نہ ہو جائیگا۔

کمل سنبھلی اور پر تاثیر نگاہوں سے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے تمام
روحانی عناصر کو مجتمع کرتے ہوئے آتشیں لہجے اور نسوانیت کے پورے وقار کیساتھ کہا
آپ میرے ساتھ پھر ایک وعدہ کیجئے۔

کیسا وعدہ؟

جب تک میں اپنے ابو کو اپنی محبت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کر لیتی آپ مجھے بھول

تو نہ جائیں گے۔ عظیم نے مردہ سی آواز میں کہا۔

اگر تم مجھے نہ بھی مل سکی تو بھی میں تمہارے سلوک، تمہارے رویے اور خلوص کو بھول نہ سکونگا۔ میرے ذہن میں ہمیشہ تم خوشبو بن کر بستی رہو گی۔

کمل بیحد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں بھی آپ سے ایک وعدہ کرتی ہوں۔ میں اب آپ سے اس وقت ملونگی۔ جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہوں گی۔ میں آپ کے لیے اپنے لہو کی بوندیں تو فراہم کر سکتی ہوں۔ آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ میں باعصمت لڑکی ہوں اور آپ کے تقدس کے ساتھ مل کر میں ایک نئی زندگی کو ابتدا کرونگی۔

اگر تم ایسا کر سکی تو میں سمجھونگا۔ میری روح کو میرے جسم سے محبت ہو گئی ہے ——

عظیم کھڑا ہو گیا۔ اٹھو اب چلیں۔

کمل بھی کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ شام کا کھانا یہیں کھا کر علیحدہ ہوں گے۔ دو محبت کرنے والوں کی طرح نہ سہی۔ دو دوستوں اور دو اجنبیوں کی طرح ہی سہی۔

شام کا کھانا انہوں نے وہیں اکٹھے بیٹھ کر کھا۔ بوجھل دلوں کے ساتھ وہ کیماڑی آئے اور جب سورج اپنے غروب ہونے والے مناظر کے ساتھ فضاؤں میں شفقی رنگ بکھیر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔



وقت کا اندھا مسافر اپنی جانی پہچانی منزلوں کی طرف بھاگتا رہا۔ سورج چنار کے بوڑھے درختوں کو چومتا ہوا غروب ہوتا رہا۔ سائے پھیلتے اور سمٹتے رہے اور زندگی کہیں اُلجھتی اور کہیں سلجھتی رہی۔ عظیم بڑی محنت اور تندہی سے بینک میں کام کر رہا تھا۔ وہ بڑی باقاعدگی سے ہر ماہ امی کو اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ بھجوا دیا تھا۔ کئی ماہ گزر چکے تھے۔ اس کی ملاقات کمل سے نہ ہوئی تھی۔ شاید وہ اسے بھول چکی تھی۔ یا ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئی تھی۔

آج بھی جب وہ اپنے آفس کے کام میں بُری طرح مصروف تھا۔ اس کے پہلو میں اپنی میز پر کام کرتے بوڑھے فرانسس نے اسے پکارا۔

عظیم! —— وہ چونکا اور فرانسس کی طرف دیکھنے لگا۔

لنچ ٹائم ہو گیا ہے۔ چھوڑو اب کام کو۔

عظیم اُٹھ کر جب باہر جانے لگا تو فرانسس نے پھر اسے پکارا۔ ذرا اِدھر آنا عظیم — وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

کہیے۔

بیٹھو!

وہ بیٹھ گیا۔ فرانسس نے فائلوں کے ریک سے ٹفن کیریئر نکالا اور اپنے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا — باہر کہاں جاؤ گے۔ کھانا کافی ہے۔ دونوں مل کر کھا لیتے ہیں۔ فرانسس نے بڑے مشفقانہ انداز میں کہا تھا۔

عظیم نے بڑی انکساری سے کہا۔

آپ روز ہی مجھے کھانا کھلا دیتے ہیں۔ آپ کا کھانا کافی لذیذ ہے۔ اگر مجھے ایسا کھانا کھانے کی عادت ہو گئی تو میری ایک اور عادت خراب ہو جائے گی۔

فرانسس ہنس دیا۔

کھاؤ کھاؤ۔ عادی ہو جاؤ گے تو کیا ہوا۔ میرا کھانا ویسے بھی ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے — عظیم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ضرورت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ لایا جاتا ہے۔

فرانسس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھانے کی طرف کھینچا۔

چلو یوں ہی سہی۔ اب شروع تو کرو نا — دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد چائے پینے وہ آفس سے نکل کر ہوٹل چلے گئے۔

جب وہ واپس آئے تو چپراسی نے عظیم کو سفید رنگ کا ایک لفافہ تھماتے ہوئے

کہا — آپ کی تار ہے عظیم بابو!

عظیم متفکر سا ہو گیا اور جلدی جلدی لفافہ کھول کر پڑھنے لگا۔ فرانسس نے متجسس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

خیریت ہے نا بیٹے!

عظیم نے کاغذ تہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ خیریت ہی ہے۔ میری امی اور چھوٹی بہن مجھے ملنے کل کراچی آ رہی ہیں — فرانسس جو عظیم کے پورے حالات سے واقف تھے اسے کریدتے ہوئے بولے۔

کیوں آ رہی ہیں تمہاری امی! اور وہ بھی اس قدر عجلت میں۔

عظیم نے بے پروائی سے کہا۔ ملنے آ رہی ہیں۔ دوبارہ وہ اپنے روزمرہ کے کام میں لگ گیا۔

اس روز آفس سے نکل کر عظیم نے ایک نئی چارپائی خرید لی اور جھونپڑی میں لگا دی۔ ماں جو آ رہی تھی۔ عارف دوسرے دوستوں کی جھونپڑی میں منتقل ہو گیا تھا۔ دوسرے روز عظیم نے آفس سے چھٹی کر لی۔ اور ماں کو لینے ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔ کافی دیر تک وہ پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ آخر پانچ بجے کے قریب گاڑی آئی اور وہ زنانہ ڈبے بڑی تیزی سے دیکھنے لگا۔

ریحانہ ایک ڈبے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ صائمہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ عظیم ان دونوں کو دیکھ چکا تھا۔ لہٰذا تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ ریحانہ نے جونہی عظیم کو دیکھا۔ نیچے اتری اور عظیم کو لپٹا کر بُری طرح پیار کرنے لگی۔ عظیم نے آگے بڑھ کر

صائمہ کو اٹھا لیا اور اسے پیار کرنے لگا۔

ماں اور بہن کو لیکر وہ جھونپڑی میں آیا۔ ریحانہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے بڑی حیرت اور پریشانی میں پوچھا۔

یہاں رہتے ہو بیٹا! ؟

عظیم ٹال گیا۔ امی! یہاں رہائش کا بڑا مسئلہ ہے اس لیے مجبوراً اس جھونپڑی میں رہنا پڑا ہے۔ ریحانہ سمجھ سی گئی۔ تاہم وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے کی کیفیت اور تاثرات بتا رہے تھے کہ عظیم کی حالت دیکھ کر اسے دکھ اور صدمہ ہوا ہے۔ شام ہو رہی تھی، عظیم نے ہوٹل سے کھانے کا بندوبست کیا اور تینوں نے مل کر کھالیا۔

عظیم نے امی اور بہن کے لیے اپنا بستر چارپائی پر لگا رہا تھا اور دوسرا بستر جو عارف کا تھا وہ اس نے اپنے لیے زمین پر لگا دیا تھا۔ صائمہ کھانا کھانے کے بعد جلدی سو گئی تھی۔ ریحانہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد جب چارپائی کی طرف آئی تو عظیم زمین پر [illegible] پر بیٹھا تھا۔ ریحانہ نے خفگی اور تکلیف دہ احساس کے ساتھ کہا۔

یہاں کیوں بیٹھے ہو بیٹے ؟

عظیم کی گردن ذرا سی جھک گئی۔ یہ چارپائی تو میں آپ کے لیے لایا ہوں امی! میں نیچے ہی سوتا ہوں۔ یہاں چارپائیوں میں کھٹمل بہت ہو جاتے ہیں اور ان پر سویا نہیں جاتا۔ ریحانہ سوچوں میں کھو گئی اور کپکپاتی آواز میں کہا۔

جب تک میں یہاں ہوں تم نیچے نہیں سو گے بیٹے! میں نے پہلے ہی تمہارے بہت غم اور دکھ برداشت کیے ہیں۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی کہ تمہیں اس حالت

میں دیکھ سکوں۔ عظیم کھڑا ہو گیا۔ ریحانہ کا ہاتھ پکڑ کر اس نے بستر پر بٹھایا اور دوبارہ اس کے پاؤں کے پاس اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

مجھے اگر آپ جیسی ماں کے قدموں میں ہی جگہ مل جاتے۔ تو میں جانونگا میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔ آپ نے اولاد کی بہت خدمت کی ہے امی۔ آپ ہمارا فرض ہے۔ آپ کی خدمت کریں۔ ریحانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ چپ ہو گئی تھی۔ عظیم کی گردن بھی جھک گئی تھی۔ پر یہ سکوت جلد ہی ٹوٹ گیا۔ ریحانہ بولی تھی۔

ادھر میرے پاس آکر بیٹھو بیٹا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

عظیم جان گیا تھا کہ ماں کیا کہنے والی ہے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کوئی بہت بڑا اور بے رحم طوفان اٹھنے والا ہے۔ ریحانہ کے پاؤں پکڑتے ہوئے اس نے کہا۔ میں یہیں آپ کے قدموں میں ہی اچھا لگتا ہوں۔ آپ کہیے کیا کہنا چاہتی ہیں امی!

ریحانہ اندر ہی اندر رو رہی تھی اور بڑی مشکل سے اس نے اپنی آنکھوں کے اندر اپنے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ وہ کہنے کی ابتدا کرنا چاہ رہی تھی۔ پر کامیاب نہ ہو رہی تھی۔ آخر ضبط کرتے ہوئے وہ بول ہی پڑی۔

تمہاری خالہ عطیہ کی شادی کر دینے پر زور دے رہی ہے اور ساتھ ہی وہ عاصمہ کی شادی بھی کر دینا چاہتی ہے۔ میں اسے معقول جواب نہیں دے سکی۔ میں ایک عجیب اُلجھن میں پڑ گئی ہوں بیٹے۔ جسے میں تمہاری مدد کے بغیر حل نہیں کر سکتی۔

عظیم نے گہری آواز میں پوچھا۔

کیا آپ نے اسی خاطر یہاں آنے کی زحمت کی ہے؟

ہاں بیٹے!

عظیم کا سر پھر جھک گیا۔

کیا میں نے آج تک آپ کے کسی فیصلے کے خلاف سر اُٹھایا ہے۔

ریحانہ رو پڑی۔ نہیں میرے بیٹے!

پھر آپ مجھ پر اعتماد رکھ کر جو بھی فیصلہ کر دیتیں۔ میں کبھی اس سے روگردانی نہ کرتا۔ آپ کی بات رکھنے کی خاطر اگر مجھے اپنی ذات کو بھی کھونا پڑے تو کبھی افسوس نہ کروں گا۔

ریحانہ کے گرم گرم آنسو عظیم کے ہاتھوں پر گر پڑے اور لرزتی آواز میں وہ بولی۔

مجھے خبر تھی بیٹا! مگر اس میں تمہارے مستقبل کا بھی سوال تھا اور دو بھائیوں کے درمیان کشیدگی، رنجش اور تعلقات منقطع ہونے کا بھی اندیشہ تھا۔

کانپتی اور روتی آواز میں عظیم نے جواب دیا۔

جب تک میری ماں مجھ سے خوش ہے۔ مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فکر نہیں۔

ریحانہ اپنی پوری قوت مجتمع کر کے پوچھا۔

اگر عاصفہ کی شادی کسی اور سے ہو جاتی تو تمہارا ردعمل کیا ہوگا۔

عظیم کچھ دیر خاموش رہا۔ یوں لگتا تھا وہ کہیں ڈوب گیا ہو پھر اس کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی سی نحیف آواز اُبھری۔

میرا ردعمل کیا ہونا ہے امی! حالات اگر میرے خلاف ہی فیصلہ دے چکے ہیں۔ تو آپ دیکھیں گی میں ثابت قدم رہونگا اور کبھی شکایت میں ہونٹ نہ کھولونگا میں وہی عظیم ہوں امی! آپ مجھ پر اعتماد رکھیں۔ حالات جس طرح آپ کو مجبور کرتے ہیں آپ ویسے ہی کر گزریں۔ عظیم اپنی ماں کے فیصلے کو ٹالنے کی جرآت نہیں کر سکتا۔

ریحانہ کھل کر ہچکیوں میں رو پڑی۔

میں تو ایسا نہ دیکھ سکتی تھی بیٹا! پر عاصفہ نے خود ہی اپنی ماں سے کہہ دیا ہے کہ وہ عظیم کے بجائے قیصر سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اب تم ہی فیصلہ دو۔ میں کیا کروں؟

فیصلہ کن انداز میں عظیم بولا۔ بس آپ ان دونوں کی شادی کر دیں۔

ریحانہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

اب میں سمجھی ہوں کہ تم گھر سے بھاگ کر یہاں کوئی آتے ہو۔ اور تم نے ریلوے ٹیشن پر مجھے منگنی کی انگوٹھی کیوں اتار دی تھی۔ کاش تم نے مجھے اس وقت بتا دیا ہوتا تو میں حالات کو سنبھال لیتی۔ لیکن اب بات بہت دور نکل چکی ہے۔ اور میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔

عظیم نے حلق میں ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

خالہ کب تک شادی کرنا چاہتی ہے؟

وہ تو اگلے ہفتے ہی تیار ہے۔

تو کر دیں آپ۔

تمہارا عندیہ لینا بھی تو ضروری تھا بیٹے!

میری طرف سے اجازت ہے امی!

خوشی سے کہہ رہے ہو؟ ریحانہ کے آنسو پھر چھلک پڑے۔

قیصر میرا چھوٹا بھائی ہے امی! اس کی خوشی میری خوشی ہے اور پھر جب عا
نے خود ہی اس سے شادی کرنے کو کہہ دیا ہے تو میں کون ہوتا ہوں ناراض ہونے وا

ریحانہ پھر بولی۔ ان دونوں کو سروس بھی مل گئی ہے۔ قیصر ایک پرائیویٹ ف
میں سیل آفیسر ہو گیا ہے اور عاصفہ ایم۔ ایس سی کے بعد لیکچرار ہو گئی ہے۔

علیم خاموش رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ ریحانہ بھی چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہ
پھر بولی۔

تو پھر تم کل میرے ساتھ چلو میں تمہیں لینے آتی ہوں۔

علیم کا سر اسی طرح جھکا رہا۔ میں ضرور چلونگا امی! میں اتنا بزدل نہیں
اپنی آنکھوں سے اپنی شکست کا تماشہ نہ دیکھ سکوں۔

میری ایک شرط بھی ہے بیٹے!

کہیے۔

قیصر اور علیہ کے ساتھ تمہاری شادی بھی ہو جاتے۔ میں سعادت بھائی
بات کی تھی۔ انہوں نے آسیہ سے تمہارا رشتہ قبول کر لیا ہے۔ میں نے ایک ما
حیثیت میں خود آسیہ سے بھی پوچھا تھا وہ تم سے شادی پر خوش ہے۔

علیم کی آنکھوں سے لگاتار آنسوؤں کے کئی قطرے ٹوٹی ہوئی سمرن کے م
کی طرح گرے اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ریحانہ بیچاری بیتاب ہو

رہ گئی۔ ماں جو تھی علیم اس کے سامنے بیٹھا رو رہا تھا۔ علیم؟ جو اس کی جان اور
روح تھا۔ بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ قبل اس
کے وہ کچھ کہتی۔ علیم نادان اور مدہم آواز میں کہتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

میں ابھی شادی نہ کرونگا امی! یہ معاملہ جہاں تک بڑھا ہے وہیں روک دیں۔
پھر وہ زمین پر بچھے ہوتے بستر پر لیٹ گیا اور چادر اوپر کھینچ لی۔ ریحانہ کو اتنی ہمت
نہ ہوئی۔ وہ اس سے کوئی اور بات کرے وہ اس طرح حسرت سے دیکھنے لگی جیسے
اس کا عزیز بیٹا اس سے کوئی چھین لے جا رہا ہو۔



تقدیر ایک بار پھر خوفناک روپ میں اس کے سامنے آکھڑی ہوتی تھی گھر
جس گھٹے گھٹے ماحول سے وہ بھاگا تھا اور جہاں سے اسے روحانی کرب اور جذ
ہیجان ملا تھا وہ پھر وہاں آگیا تھا۔ ریحانہ اسے اپنے ساتھ گھر جو واپس لے آئی تھ
قیصر کی عاصفہ اور عطیہ کی عاصفہ کے بھائی سے شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں
ریحانہ اور سعادت کی خواہش تھی کہ عظیم کی شادی ساتھ ہی ساتھ آسیہ سے
جاتے۔ پر عظیم نے شادی کرنے سے قطعی اور زوردار انکار کر دیا تھا۔ سعادت
لاکھ سمجھایا۔ ریحانہ نے اونچ نیچ سے آگاہ کیا لیکن وہ نہ مانا۔ اس لیے قیصر اور عط
شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ عاصفہ اپنے گھر جا چکی تھی۔

عظیم اپنے بھائی بہن کی شادی کی تیاریوں میں بُری طرح مصروف ہوگ
رات بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ ظاہراً وہ مطمئن اور بشاش تھا۔ لیکن اس کے دل

لاوہ اُبل رہا تھا۔ ریحانہ اس سے پوری طرح باخبر تھی۔ وہ جب بھی عظیم کو یُوں لگن سے
کام کرتے دیکھتی اکثر چھپ چھپ کر رو دیتی تھی۔

بہر حال عظیم نے اپنے آپ کو بدل لیا تھا۔ خاموش اور سنجیدہ عظیم پھر
کہیں کھو گیا تھا۔ اور اس کی جگہ اب پرانا عظیم تھا جو بات بات پر اپنی امی اور بہن
بھائیوں کے ساتھ قہقہے لگانے لگا تھا۔ وہ سب کچھ مصنوعی ہی سہی پھر بھی اس نے اپنے
آپ کو بدل تو لیا تھا نا۔ ریحانہ اور عطیہ اکثر عظیم کی اس حالت پر خوفزدہ ہو جاتی تھیں۔

جس روز قیصر کی بارات جانا تھی عظیم بے حد خوش تھا۔ ریحانہ اور عطیہ بھی خوشی
کا اظہار کر رہی تھیں۔ پر ویسے نہیں جس طرح ہونا چاہیئے تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹی
محسوس کرتی تھیں جیسے اس گھر کی کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ وہ جب عظیم کے باطن
میں جھانکتی تھیں تو انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ وہ عظیم نہیں جوان کا تھا یہ کوئی
مصنوعی اور مشینی عظیم تھا جیسے شادی کی تقریب میں شرکت لینے کے لئے مشینی انداز
میں چابی دیکر وہاں بھیج دیا گیا ہو۔

ریحانہ نے بڑی تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ عظیم کے لیے ایک بے حد
مہنگا سوٹ سلوایا تھا۔ قیصر کی شادی کے روز اس نے خود عظیم کو وہ سوٹ پہنایا۔
عظیم کے چاروں طرف گھوم کر اس نے بغور اس کا جائزہ لیا پھر وہ ٹکٹکی باندھ کر اپنے
شوہر کی اس تصویر کی طرف دیکھنے لگی جو کمرے کی دیوار سے آویزاں تھی۔ دونوں باپ
بیٹے کی شخصیت کس قدر تعجب کی مشابہت رکھتی تھی۔ ریحانہ کچھ دیر تک اپنے شوہر
کی تصویر کو دیکھتی رہی پھر ایک نگاہ اس نے اپنے سامنے کھڑے عظیم پر ڈالی۔

بے اختیار ہو کر وہ آگے بڑھی اور پیار سے عظیم کی پیشانی چوم لی۔ اس کی آنکھوں میں آ
کیسے آنسو تھے؟ —— خبر نہیں —— شاید مرحوم شوہر کی یاد ہو یا ——
بیٹے کی اپنے باپ کی طرح جوان اور توانا ہونے کی خوشی۔ بہر حال اس کے آنسو
رہے تھے۔ عظیم کی پلکیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

اسی لمحہ جبکہ وہ دونوں ماں بیٹا اس ماحول میں ڈوبے ہوتے تھے ر
اندر داخل ہوتے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر وہ ٹھٹکے پر دونوں ماں بیٹے
جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھ لیے۔ سعادت اپنے بھائی کی تصویر کو دیکھ کر
کچھ بھانپ گئے۔ اتنے میں ریحانہ نے سنبھلتے ہوتے اس گہرے اور جا
سکوت کو توڑا۔

بھائی جان! میں چاہتی ہوں قیصر اور عطیہ کی شادی پر سارا خرچہ عظیم ا
سے کرے تاکہ میرے بچوں کو یہ احساس نہ ہو کہ ان کا باپ ان سے ہمیشہ کے
روٹھ چکا ہے۔ آپ کو اس پر کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟

سعادت نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھابی! عظیم جب میرے سامنے ہوتا
میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ میرا بھائی اپنے نامکمل وجود کے ساتھ میرے سامنے
کھڑا ہے ——

تینوں ایک ساتھ باہر نکل گئے۔

قیصر کی بارات گئی اور خوب دھوم سے گئی —— سعادت کی کار

دولہا بنا بیٹھا تھا اس کے ساتھ ریحانہ اور عظیم تھے۔ صائمہ کو عظیم نے اپنی گود میں بٹھا
رکھا تھا۔ اگلی سیٹ پر سعادت کے ساتھ آسیہ بیٹھی تھی۔ دوسرے باراتیوں کے لیے
بس کا انتظام تھا۔

نکاح کے بعد جب قیصر لڑکیوں کے نرغے میں پھنسا ہوا تھا اور اس سے
قریب ہی عظیم نوٹ گن گن کر قیصر کی سالیوں کو لاگ دے رہا تھا۔ نداق کرنیوالی
لڑکیوں میں سے کسی نے کہا۔

بے شرم! تم نے تو بڑے بھائی کی منگیتر چھین لی ہے۔

عظیم تھوڑی دیر کو چونکا۔ چہرے پر درندگی اور وحشی جلال چھا گیا۔ پر فوراً ہی
ضبط کر گیا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے زبردستی مسکرا دیا۔ وقتی طور پر قیصر
سر بھی جھک گیا تھا۔ لیکن یہ تو سب کچھ عارضی تھا۔ جلد ہی وہ اپنے چہرے کے سائے
نوش سمیٹ گیا تھا۔

عظیم نے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھاتے اور خود اپنے ہاتھوں سے
صفہ کو قیصر کے لیے بیاہ کر گھر لے آیا۔ دنیا کا بھی عجیب دستور ہے کوئی اپنی دلہن بیاہ
لایا اور کوئی اپنا جنازہ اپنے ہی کندھوں پر اٹھا لایا۔ عظیم نے اس حد تک اپنے
کو فنا کر دیا تھا کہ عطیہ اور بے بی کے ساتھ مل کر اس نے قیصر اور عاصفہ کے لیے شب عروسی
پلنگ بھی خود سجایا۔

قیصر نے ساری خوشیاں اپنی جھولی میں سمیٹ لیں۔ اور عظیم کی چھلنی کی طرح
کی جھولی میں غم ہی غم اور فسادات گرے۔ قیصر زندگی کے دکھوں اور قنوطیت

کے تیز دھارے کو عبور کر کے ساحل پر جا کھڑا ہوا اور عظیم بیچارہ منجدھار میں ڈوب
گیا۔ قیصر خوشیوں کی شہ نشین پر کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ جبکہ عظیم غموں کی دہلیز پر کھڑا
اپنے ناسور جیسے زخموں پر کراہ رہا تھا۔ سماج کے ڈرامے میں قیصر ظالم اور عظیم مظلوم
بن گیا۔ زندگی کی بساط اور بازی میں قیصر جیت گیا اور عظیم اپنا سب کچھ ہار کر اپنی جھا
جھاڑتا ہوا کچلے مسلے انسان کی طرح آہیں بھرتا ہوا اٹھ گیا۔

عظیم کی حالت اس حرماں نصیب فاختہ جیسی تھی جس کے انڈے کوے پی
گئے ہوں۔ وہ ہار گیا تھا۔ زندگی کے وسیع میدان میں — لوٹ لیا گیا تھا۔ زلیستہ
بارونق بازاروں میں۔ قیصر کی سہاگ رات جو اس کے لیے کرب اور محشر کی رات تھی کہ
نہ کسی طرح گزر ہی گئی۔

دوسرے روز عطیہ کی بارات آنا تھی۔ قیصر تو عاصفہ کے پاس اس طرح بیٹھا تھا
مرغی اپنے انڈوں سے نہیں ہلتی اس لیے عظیم کو سارا کام اکیلے ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ سعاد
اور آسیہ ہر کام میں اس کی مدد کر رہے تھے۔ اکیلے نے صحن میں شامیانہ لگوایا۔ جہیز
درست کرائیں۔ برتن اور حمام سلیقے سے لگوائے عطیہ کی شادی میں وہ قیصر سے بھی ز
دلچسپی لے رہا تھا۔

آخر بارات آئی۔ دن بھر گتا رہا اور ساتے بڑھتے رہے۔ نکاح ہوا اور رسم
کے بعد رخصتی کی تیاری شروع ہو گئی۔ عطیہ رو رہی تھی۔ دھاڑیں مار مار کر — پہلے
آسیہ سے گلے مل کر روتی۔ پھر سعادت اور قیصر سے ملنے کے بعد جب وہ ریحانہ
گلے مل کر روتی تو ماحول زیادہ غمگین ہو گیا تھا۔ دونوں ماں بیٹی رو رہی تھیں اور

نہ عطیہ کی ٹانگوں سے لپٹ کر آنسو بہا رہی تھی۔
ماں سے علیحدہ ہونے کے بعد عطیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اس کی نگاہیں عظیم کو
ش کر رہی تھیں۔

عظیم؟

جو اس کا باپ بھی تھا اور بھائی بھی۔ جو اس گھر کا ستون بھی تھا اور سہارا بھی مگر
سب کی نظروں سے اوجھل اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا رو رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے
ت کی طرف دیکھ رہا تھا اور آنسو اس کی گالوں پر بہتے ہوئے اس کی قمیض کو بھگو
ہے تھے۔

عطیہ ریحانہ اور بے بی کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئی۔ عظیم نے نگاہیں سیدھی
کے تینوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوب سرخ اور آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔
انہ اس کی حالت دیکھ کر دہل گئی۔ عظیم کھڑا ہو گیا۔ عطیہ لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور
ائی کے کندھے پر سر رکھ کر وہ روتے روتے چلا اٹھی۔

بھیا! میرے پیارے بھیا۔

ریحانہ نے خود بھی روتے ہوئے دونوں بہن بھائی کو علیحدہ کیا اور سنبھلتے ہوئے
م کی پیٹھ سہلا کر کہا۔

بہن کو اپنے ہاتھوں سے وداع کر دو بیٹا! تاکہ اسے احساس نہ ہو کہ اس کے ابو۔
ا سے آگے کے الفاظ ریحانہ حلق میں ہی پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔ عظیم عطیہ کو
ارا دے کر باہر لایا اور پھولوں سے سجی ہوئی کار میں لا بٹھایا۔ بارات رخصت ہو گئی۔

عظیم عطیہ کی جاتی ہوئی کار کو اس وقت تک دیکھتا رہا۔ جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

عطیہ جا چکی تھی۔ عظیم ریحانہ اور بے بی اداس تھے۔ قیصر پر کوئی اثر نہ تھا وہ ا[illegible] کی عظمت اور بھائی کے احترام کو بھول کر عاصفہ کے پاس بیٹھا اس طرح باتیں کر رہا [illegible] جیسے ان دونوں کو کوئی دیکھ ہی نہ رہا ہو۔

قیصر کی سہاگ کی وہ دوسری رات مگر عظیم کے لیے وہ دکھوں کی سیاہ رات رات بارہ بجے تک وہ گھر سے باہر رہا۔ پھر آکر بستر میں دبک گیا۔ دوسرے روز عا[illegible] کے ماں باپ اسے لینے آ گئے۔ عظیم اور قیصر بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ قیصر ویسے ہی عاصفہ کے ساتھ جاتا تھا اور عظیم عطیہ کو لانے گیا تھا۔ عظیم وہاں رات نہ چاہتا تھا۔ پر خالہ کے مجبور کرنے پر رکنا پڑا۔ دوسرے روز وہ عطیہ کو گھر لے گیا۔ اور عاصفہ بھی اس کے ساتھ آ گئے تھے۔ عاصفہ عظیم کا سامنا نہ کر پا رہی تھی۔

گنہگار اور مجرم جو تھی۔

قصوروار اور خطاکار جو تھی۔

عظیم خود بھی اس سے اجنبی ہو بیٹھا۔ وہ کسی کی ہو گئی تھی۔ اسے اب ا[illegible] سے دیکھنا ہی گناہ تھا۔ تیسری رات بھی حسب معمول بیقراری اور اضطراب [illegible] گاڑی کی روانگی سے صرف تین گھنٹے قبل عظیم نے ریحانہ پر کراچی جانے کا [illegible] کیا۔ وہ بچاری پیلی ہو کر رہ گئی۔ عطیہ بھی پاس بیٹھی تھی۔ عظیم جب ماں کے پاس بیٹھنے لگا تو اس نے دکھتے لہجے میں کہا۔

یہیں کہیں سروس کر لو بیٹے! اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے میں چاہتی ہوں اب تم میری نگاہوں کے سامنے رہو۔

وہیں کھڑے کھڑے عظیم کا سر جھک گیا اور بھاری آواز میں اس نے کہا میرے اور آپ کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے امی! قیصر اور عطیہ دونوں کی شادی ہو گئی ہے۔ خدا کرے یہ دونوں خوش حال زندگی کی ابتدا کریں۔ مجھے امید ہے قیصر آپ کا خیال رکھیگا۔ میں اب کہیں بھی چلا جاؤں میں مطمئن ہوں گا۔ کہ میں اپنے ایک عظیم فرض سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔ اور پھر میں کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑا ہی جا رہا ہوں امی!

لوگ تو پیٹ کی خاطر ملک سے باہر اتنے اتنے برس گزار آتے ہیں۔ میں تو صرف کراچی ہی جا رہا ہوں۔

ریحانہ اس کی باتوں سے اور زیادہ زخمی ہو گئی تھی۔ منت کرنے کے انداز میں اس نے عظیم سے کہا —— تم نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹالی بیٹے! مجھے تم جیسے بیٹے پر فخر ہے۔ صرف ایک بات اور مان لو پھر زندگی بھر میں تم سے کچھ نہ کہوں گی میرے بیٹے!

عظیم سب کچھ سمجھ اور جان رہا تھا۔ وہ ان باتوں میں نہ پڑنا چاہتا تھا پر ماں کی تسلی بھی تو ضروری تھی اس لیے اسے بولنا پڑا۔

امی! شادی کے علاوہ آپ میرا سر بھی مانگیں تو انکار نہ کروں گا۔

ریحانہ کہیں کھو کر رہ گئی اور دکھ سے کہا۔

میرے بیٹے! اندھیری رات کا وہ مسافر جس کے پاس اپنی رہبری کے لیے
صرف ایک ہی چراغ ہو۔ وہ ہوا کے تیز جھونکوں میں بھی اسے بجھنے نہیں دیتا خواہ
اس کشمکش میں اس کے ہاتھ ہی کیوں نہ جل جائیں۔ تم میری زندگی کا چراغ ہو علیم میں
چاہتی ہوں اس گھر کے آنگن میں تمہارے بچے ناچیں کودیں۔

میرے لال! میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ میں سکون سے گھر پڑی رہوں
اور میرا بیٹا۔ سکون، شانتی اور آسودگی کی تلاش میں دھکے کھاتا پھرے۔ بس میں تمہیں
خوش دیکھنا چاہتی ہوں بیٹے۔ اس کے علاوہ میری کوئی آرزو نہیں ہے۔

میں کوئی چراغ سحری نہیں ہوں امی! آپ دیکھیں گی ایک روز میں تابناک آفتاب
بن کر طلوع ہونگا۔ جس کی سنہری کرنیں ہمیشہ آپ کے پاؤں چومتی رہیں گی۔

خدا کرے ایسا ہی ہو بیٹے۔ پر تم شادی تو کر لو نا۔ آسیہ کی بھی مرضی ہے اور سعادت
بھائی بھی اس پر خوش ہیں۔ آسیہ اگر عاصمہ سے خوبصورت نہیں تو اس سے کم بھی نہیں

علیم کو ایک اور بہانہ مل گیا:
امی! ابھی تو آسی پڑھ رہی ہے۔ جب وہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرے گی دیکھا جائیگا۔
ریحانہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

جب وہ ڈاکٹری کرے پھر تم اس سے شادی کر لو گے نا۔ انکار نہ کرنا بیٹے میرا
دل ٹوٹ جائیگا۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں رہی کہ تمہیں اکیلا بھٹکتے دیکھ سکوں۔
علیم نے ریحانہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی ہی نمی تھی اس کا دل پسیج گیا۔

ماں جو تھی ـــ اور ماں بھی۔
وہ ماں ؟
جسے وہ دنیا کی ہر چیز سے افضل و عزیز جانتا تھا۔ اس کا سر آپ ہی آپ جھک گیا
اور ہلکے سے اس نے کہہ دیا۔
ہاں امی!

ریحانہ آگے بڑھی اور علیم کو لپٹا کر بڑی تیزی سے اس کی پیشانی، گال اور سر
چوم لیا۔ پاس بیٹھی علیمہ اور بے بی مسکرا رہی تھیں۔ ریحانہ تیزی سے اپنے کمرے
میں داخل ہوئی ایک اٹیچی سے کوئی چیز نکالی اور اس مٹھی میں دبا کر وہ سعادت کے
مکان کی طرف چلی گئی۔

ریحانہ تھوڑی دیر بعد لوٹی۔ اس کے ساتھ سعادت بھی تھے۔ دونوں مسکرا رہے
تھے۔ سعادت نے آتے ہی سونے کی ایک قیمتی اور وزنی انگوٹھی علیم کو پہنا دی۔ علیم
شش و پنج میں ہی پڑا تھا کہ ریحانہ بول پڑی۔

میں آسیہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنا آئی ہوں بیٹے! اور یہ بھائی جان کی طرف سے
تمہاری منگنی کی انگوٹھی ہے۔ انگوٹھی پہنا کر سعادت نے علیم کو لپٹا لیا۔

تم نے میری بات رکھ لی ہے بیٹے! میں بے حد خوش ہوں ـــ اپنے
گھر کے لان میں کھڑی آسیہ یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ علیم اپنے کمرے میں چلا گیا۔
اور اپنے کپڑے سمیٹ کر اپنے اٹیچی میں جمانے لگا۔ ریحانہ نے منت کرنے کے
انداز میں سعادت سے کہا۔

وہ پھر کراچی جا رہا ہے۔ بھائی جان۔ آپ ہی اسے روکیں۔ شاید آپ کی بات مان جاتے۔ سعادت فوراً سنجیدہ ہو گئے۔

آپ اس سے زیادہ نہ الجھیں بھابی! فی الحال اسے جانے دیں۔ وہ بڑا احساس بچہ ہے یہاں عاصفہ کی موجودگی میں یوں ہی بیچارہ کڑھتا اور جلتا رہے گا۔

عظیم اپنا اٹیچی اٹھاتے باہر آگیا۔ ریحانہ نے بڑی بیچارگی سے پوچھا۔ قیصر سے ملے ہو بیٹے!

عظیم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے کمرے میں ہے امی! میں وہاں جا کر کس طرح اسے مل سکتا ہوں۔ ریحانہ نے وہیں کھڑے کھڑے قیصر کو آواز دی۔ پہلی آواز پر قیصر نے کوئی جواب نہ دیا۔ ریحانہ نے دوسری بار اسے پکارا۔ قیصر نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ وہ عاصفہ کے پاس جو بیٹھا ہوا تھا۔ عظیم کے چہرے پر وہی پرانی درندگی اور وحشی جلال چھا گیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ دندناتا ہوا قیصر کے کمرے میں داخل اور اس کی وہ زبان پکڑ کر کاٹ دے جس سے وہ اس کی ماں کی پکار کا جواب نہ دے رہا تھا۔

ریحانہ خود بھی عظیم کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی تھی۔ لہٰذا اس نے تیسری بار زور سے قیصر کو پکارا۔ تیسری بار قیصر اپنے کمرے کے دروازے پر آیا اور پھیکی سی آواز میں اکھڑے سے لہجے کے ساتھ پوچھا۔

کیا ہے امی!

ریحانہ نے چوٹ کھاتے لہجے میں کہا۔

عظیم جا رہا ہے۔ اسے گاڑی تو چڑھا آؤ۔

قیصر باہر آیا اور اچاٹ سے لہجے میں عظیم سے پوچھا۔

چھٹی ختم ہو گئی آپ کی؟

عظیم نے کھا جانے والی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

امی نے یوں ہی تمہیں تین بار پکار لیا ہے۔ تمہیں میرے ساتھ اسٹیشن جانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا وقت ضائع ہوگا۔ جاؤ اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ انکل مجھے اسٹیشن چھوڑ آئیں گے۔ یہ ایک تلملا دینے والی ضرب اور چوٹ تھی جو عظیم نے قیصر پر لگائی تھی۔ لیکن وہ احمق کچھ سمجھا ہی نہ تھا۔ عاصفہ کے چکر میں وہ اپنا آپ اور دوسروں تک کو بھول جو گیا تھا۔

عظیم نے سعادت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آیئے انکل چلیں۔ کسی کو بھی کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ قیصر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ریحانہ، عطیہ اور بے بی ان دونوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ ان کا رُخ سعادت کے مکان کی طرف تھا۔

آسیہ لان میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ عظیم کو سب کے ساتھ اس نے جو ادھر آتے دیکھا فوراً کھڑی ہو گئی اور اپنی ساڑھی کا پلو منہ میں لیتی ہوئی وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

سعادت نے اسے پکارا۔

آسی! بات سنو بیٹی!

آسیہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔

سعادت آگے بڑھے۔ ایک ہاتھ سے انہوں نے آسیہ کا کانپتا ہوا گورا سرخ ہاتھ

پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ میں انہوں نے علیم کا ہاتھ تھامتے ہوئے آسیہ سے کہا۔

آسی بیٹے! آج سے تم علیم کی ہو۔ تم دونوں آپس میں خط وکتابت کرنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں تمہیں اس بات کی بھی اجازت دیتا ہوں کہ آئندہ سے تم اپنا نام آسیہ کے بجائے آسیہ علیم لکھو مجھے خوشی ہوگی۔

آسیہ کا سر جھک گیا تھا اور نازک جسم اس طرح کپکپا رہا تھا جیسے کوئی نوزائیدہ نونہال جس کی ٹہنیاں ابھی کچی اور نازک ہوں اور تیز ہواؤں میں لرز کانپ ہو رہا۔

سعادت نے ریحانہ سے کہا۔

بھابی آپ لوگ گھر ہی رہیں۔ میں اور آسی علیم کو گاڑی چڑھا آتے ہیں۔

ریحانہ علیم کو لپٹا کر پیار کرنے لگی۔ سعادت نے گیراج سے کار نکالی۔ علیم اور آسیہ کو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا اور دونوں چپ چاپ سعادت مند بچوں کی طرح کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ سعادت نے کار نکال کر اسٹیشن جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ ریحانہ وہیں کھڑی علیم کو نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ کار کے اندر بیٹھی ہوئی آسیہ بار بار چور نگاہوں سے علیم کو دیکھ رہی تھی اب وہ اس کا منگیتر اور منسوب جو تھا۔



علیم پھر کراچی جیسے پرشور اور بارونق شہر میں آ گیا تھا۔ مگر اس کے دل کا شہر اب بھی سنسان اور ویران تھا۔ بھائی کے لگاتے ہوئے چرکے اور گھاؤ کو وہ بھول جانا چاہتا تھا۔ پر داغ ایسا تھا مٹ نہ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اکثر مصروف رکھنے کی کوشش کرتا لیکن ذہن پھر بھی منتشر ہو جاتا تھا۔

قیصر اور عطیہ کی شادی میں ہنسنے اور قہقہے لگانے والا علیم پھر کہیں کھو گیا تھا۔ بالکل اس سرسام زدہ انسان کی طرح جس نے غم و حسرت کی نقاب اوڑھ لی ہو۔ یا اس کرب آشنا روح کی طرح جسے تاریکی کے پردوں میں ملفوف کر دیا گیا ہو۔ وہ پھر بھٹکنے پر مجبور تھا۔ غول سے جدا پرندے کی طرح۔ پنجر کے مغموم گیت کی طرح۔ وہ اپنے تشخص تک کو بھول گیا تھا کہ کوئی اس کا مونس تنہائی نہ تھا۔ وقتی طور پر آسیہ کو اس کا ساتھی ضرور بنا دیا گیا تھا۔ لیکن کراچی آ کر اس کے دل میں کمل کے لیے مدھم مدھم اور

میٹھی میٹھی سی آنچ ضرور ابھری تھی۔ سری لنکا کی قدیم لڑکیوں کی طرح وہ مقدس، خوبصورت، دلکش اور اسرار خیز لڑکی عاصفہ کے صبر شاید اس کے دل کو بھا گئی تھی۔

کراچی آکر اس نے پہلی رات بڑی کرب اور تکلیف کی حالت میں گزاری۔ رہ رہ کر ماں کا اداس اور مغموم چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا تھا اور وہ خود بھی افسردہ اور مغموم ہو جاتا تھا۔ اس دریا کی طرح جسے سمندر نصیب نہ ہوا ہو۔

دوسرے روز جبکہ وہ آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کمل جھونپڑی میں داخل ہوتی۔ اس کا چہرہ پھول کی طرح خوشگوار اور انناس کی طرح رس دار ہو رہا تھا۔ پکے ہوتے لسوڑے کی طرح اس کا جسم بھرا ہوا اور رس دار تھا۔ عظیم کے پاس آکر بیٹھتے ہوتے اس نے کہا۔

آپ گھر سے کب آتے؟

عظیم نے حیرت سے پوچھا۔

تمہیں کیسے علم ہوا میں گھر گیا تھا؟

یہ، پچھلے دو دنوں سے لگاتار آپ کا پتہ کرنے آتی رہی ہوں۔ آپ کے ساتھی نے بتایا تھا کہ آپ گھر گئے ہیں۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوتے پوچھا۔

آپ کا ساتھی کہاں گیا؟

عظیم جو بوٹ پہن رہا تھا۔ تسمے باندھ کر سیدھا کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

وہ اپنے کام پر جا چکا ہے۔

کمل تھوڑی دیر تک بڑے شوق سے عظیم کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کی بہار کی صبح

نسیم ہوا کے پہلے جھونکے جیسی آواز سنائی دی۔

میں آپ سے ایک خوش خبری کہنے آئی ہوں۔

کیسی خوش خبری۔

میرے ابو نے مجھے آپ کو اپنانے کی اجازت دے دی ہے۔

عظیم نے چونک کر پوچھا۔ سچ؟

کمل اس کے سامنے کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

قسم خدا پاک کی میرے ابو رضامند ہو گئے ہیں۔ عظیم نے مسکراتے ہوتے اپنے بازو پھیلا دیتے اور چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

اسی خوشی میں میرے گلے لگ جاؤ۔

کمل ذرا جھجکی پھر بھاگ کر اپنی پوری قوت کے ساتھ وہ عظیم سے لپٹ گئی جیسے کہ ہنزہ اور سوات دریا آپس میں لپٹتے ہیں۔ جیسے پنجاب کے جہلم اور چناب دوسرے سے ملتے ہیں۔ جیسے بلوچستان کے اوڑک کے چشمے کا پانی سیب غات سے بغلگیر ہوتا ہے جیسے سندھ کی حب ندی بھاگتی کودتی اور سانپ کی ل کھاتی ہوتی سمندر کی گود میں گرتی ہے۔ ان کے چاروں بازو ایک دوسرے ل پیوست ہو گئے تھے جیسے جیسے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان چاروں، اپنی اپنی انفرادیت کو بھول کر پوری یکجہتی اور اتحاد سے کام لیکر اپنے ضمیر کی رل سے مجتمع اور متحد ہو کر صرف ایک اکائی اور عدم متبائن بن گئے ہوں۔

کمل علیحدہ ہوتی ہوتی بولی۔

آپ آج آفس کے بعد سیدھے ہمارے گھر آئیں۔ میرے ابو آپ کو د
ہیں ـــــ میں نے تمہارا گھر ہی نہیں دیکھا ہوا۔
میں میر لویڈ ٹاور کے پاس آپ کا انتظار کروں گی۔ وہاں سے میں خ
اپنے گھر لے جاؤں گی۔ دیر نہ کیجئے گا۔ یہ نہ ہو شام تک میں وہیں سکڑتی رہو
عظیم مسکرا رہا تھا۔ میں ضرور آؤں گا۔
مجھے مبارکباد بھی دیجئے۔
کیسی
میں بی۔ اے کر گئی ہوں۔ سیکنڈ کلاس آئی ہے۔
ویری گڈ
آؤ پھر چلیں مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔
کل اُٹھ کر اس کے ساتھ ہولی۔ الیکٹرک سپلائی کارپوریشن تک دونوں
وہاں سے رکشے میں بیٹھ کر کل بائیں ہاتھ کیماڑی کی طرف چلی گئی۔ اور عظیم
کے ساتھ ساتھ دائیں ہاتھ اپنے آفس کی طرف چلا گیا۔
آفس کا ابھی وقت نہ ہوا تھا۔ بہرحال آفس کا سارا اسٹاف اپنی اپنی س
پر بیٹھا تھا۔ عظیم کو اپنی کرسی پر بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ فرانسس آ
ہی وہ عظیم سے بغلگیر ہوا اور مسکراتے ہوتے پوچھا۔
کیسے ہو بیٹے! کب آتے ہو۔ تمہارے گھر کے حالات کیسے ہیں۔ فرا
ایک ہی سانس میں کئی سوال کر گیا۔ عظیم ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ

غیر موجودگی میں میرا کام بھی بن گیا۔
یسا کام؟
ینک کی لاہور برانچ میں اکاؤنٹنٹ کی سیٹ خالی ہوگئی ہے اور میں نے
پنی ٹرانسفر کی ایپلیکیشن دے دی ہے۔ اُمید ہے میرا کام ہو جائے گا۔ میں
ریض ہوں اور کراچی کی نمکین سمندری ہوا میرے جسم کے خمیر سے انطباق نہیں
ں۔
رانسس سے علیحدہ ہو کر عظیم نے ایک بار آفس کا جائزہ لیا۔ پورا
لا ہوا تھا۔ کلرک قیمتی اور اجلے کپڑے پہنے کچھ اس طور اور شان سے اپنی
پر بیٹھے تھے گویا آفس کام کرنے نہیں کسی فلم کی شوٹنگ میں حصّہ لینے آتے
ورنہ یہ وہی کلرک تھے جو میلے اور استری کیے بغیر کپڑے بھی آفس پہن آیا کرتے
ہم نے اپنا اور فرانسس کا جائزہ لیا۔ دونوں کے وہی پرانے کپڑے تھے۔
ں کی طرف دیکھتے ہوتے عظیم نے حیرت سے پوچھا۔
آفس کا ماحول کچھ بدل نہیں گیا؟
ں بدل گیا ہے؟
ئی وجہ ہے یا یوں ہی۔
ہت بڑی وجہ ہے۔ ابھی چند لمحوں تک تم خود ہی جان جاؤ گے۔
کیسے؟
نس میں ایک بے حد حسین ٹیلیفون آپریٹر لڑکی آئی ہے اور یہ سارے لوگ

سب اسے پھانسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی لیے تو روزانہ بن سنوَر
ہیں۔ جوان تو جوان۔ بوڑھے بھی جو خود جوان بیٹیوں کے باپ ہیں اور ج
سے دانت تک گرنا شروع ہو گئے ہیں وہ بھی اس تاریک اور سیاہ
میں حصہ لے رہے ہیں۔ ویسے لڑکی کے آنے سے ایک فائدہ ضرور ہو
کیسا فائدہ۔

آفس کا سارا اسٹاف خوب اجلا اور اسمارٹ ہو کر آفس میں آنے
یوں ایک طرح سے دفتر میں دفتریت آگئی ہے۔ عظیم صرف مسکرا کر رہ گ
نے پھر پوچھا۔

بھائی اور بہن کی شادی کر آئے ہو۔

عظیم چونک سا گیا۔ جی ہاں۔

اور اپنی ہ فرانسس کی آواز میں دکھ اور ہمدردی تھی۔

عظیم کا سر جھک گیا اور چہرہ ماند پڑ گیا۔ شاید پرانی یادیں پھر ہجو
کافی دیر تک وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ بس سر جھکائے کرسی پر بیٹھا رہا۔ فر
بجھے ہوئے چراغ کی طرح افسردہ انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر سنبھل

عظیم! انسانی زندگی شطرنج کا ایک کھیل ہے۔ ہر کوئی اس کی بر
پر داؤ لگاتا ہے۔ کسی کی ہار ہوتی ہے اور کوئی جیت جاتا ہے۔ ہمت نہ
ولولے کے ساتھ دوبارہ اٹھو اور پوری قوت کے ساتھ تقدیر کے
کی عنان قابو میں کر کے رونما ہونے والے حالات کو اپنے سامنے جھ

عظیم کا سر پھر بھی جھکا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ فرانسس نے بات کا
رُخ بدلا۔

آج آفس کے بعد تم میرے ساتھ میرے گھر چلنا۔ میں تمہارے ساتھ تمہاری زندگی
کا ایک اہم فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ عظیم چونک پڑا اور کہیں دُور سے بولا۔

آج تو میں نے اپنے ایک شناسا سے آفس کے بعد میر پویدرٹا ور ملنے کا
وعدہ کیا ہے۔

فرانسس نے لاپروائی سے کہا۔ تو کیا ہوا۔ اسے میر پویدرٹا ور مل کر میرے
ساتھ چلنے جانا۔

عظیم جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رُک گیا۔ آفس کا پورا اسٹاف نگاہیں اُٹھا اُٹھا
کر آفس کے بیرونی گیٹ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک
بے حد حسین لڑکی آفس میں داخل ہوئی۔ فرانسس نے عظیم کا بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

یہ ہے وہ لڑکی۔ بچاری نے خبر نہیں کس مجبوری کے تحت سروس کی ہو گی اور یہ
لوگ اس کے پیچھے یوں پڑ گئے ہیں۔ جیسے بکری کے پیچھے بھیڑیا۔

لڑکی نے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ عظیم کی میز کے ساتھ ہی وہ
اپنے لکڑی کے کیبن میں داخل ہوئی اور اپنے کام میں لگ گئی فرانسس اور عظیم بھی
اپنا روزمرہ کا کام کرنے لگے تھے۔

آفس ٹائم کے بعد عظیم نے بچنے کی انتہائی کوشش پر فرانسس نے زبردستی اسے
اپنی موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھا لیا اور اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ میر پویدرٹا ور آ کر فرانسس

نے موٹر سائیکل روکی اور عظیم سے کہا۔

مل لو کس سے ملنا ہے؟

عظیم نیچے اترا اس نے دیکھا کمل ایک طرف کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ کمل نے بھی عظیم کو دیکھ لیا تھا اور وہ بھی تیزی سے عظیم کی طرف بڑھی تھی۔ قبل اس کے عظیم کمل سے کوئی بات کرتا اسے اپنے پیچھے سے فرانسس کی آواز سنائی دی۔

کمل بیٹی! تم یہاں؟

عظیم چونک سا پڑا۔ کمل عظیم کے پاس سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی اور فرانسس سے مخاطب ہوئی۔

ابو! آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔

فرانسس موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے عظیم کی طرف اشارہ کر کے بولے بیٹی! میں اس لڑکے کو ساتھ لایا ہوں جس سے میں تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اب تم اسے دیکھ کر اندازہ لگا سکتی ہو کہ آیا شخصیت میں وہ لڑکا اچھا ہے جسے تم پسند کر چکی ہو یا یہ جو تمہارے لیے میرا انتخاب ہے۔

کمل مسکرا رہی تھی۔ ابوجی! یہ وہی تو ہیں جنہیں میں پسند کر چکی ہوں۔ انہیں میں نے آج آفس کے بعد ٹاور پر ملنے کو کہا تھا۔ آج میں انہیں آپ کے پاس لا رہی تھی۔ آپ نے خود ہی تو انہیں آج گھر لانے کو کہا تھا۔

فرانسس نے ہنستے ہوئے کہا۔ بیٹی! اگر یہ عظیم تمہاری پسند ہے تو میں تمہارے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ میں عظیم کو ایک عرصہ سے جانتا ہوں۔ اور پچھلے کئی ماہ سے

میں اسے تمہارے لیے منتخب کر چکا ہوں۔ پھر انہوں نے عظیم سے کہا۔

عظیم! میں جا رہا ہوں بیٹے! تم کمل کو لیکر رکشے میں آجاؤ۔ نہیں تو ٹھہرو اکٹھے ہی چلتے ہیں۔ فرانسس نے خود ایک رکشہ میں دونوں کو بٹھایا۔ پھر وہ اپنے موٹر سائیکل پر بیٹھے اور ریکماڑی کی طرف بڑھ گئے۔

تینوں ایک ساتھ دو کمرہ کے ایک صاف ستھرے مکان میں داخل ہوئے۔ جسے خوب اچھی طرح ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ سامنے والے کمرے میں چھوٹی سی ایک لڑکی بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ فرانسس نے اس سے عظیم کا تعارف کرایا۔

یہ میری چھوٹی بیٹی سیبل ہے۔ تیسری میں پڑھتی ہے۔ فرانسس رک گئے اور دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہوئی کمل کو آواز دی۔

کمل ادھر آؤ بیٹی!

کمل لجاتی شرماتی ہوئی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ فرانسس نے اسے اپنے سامنے عظیم کے ساتھ صوفہ پر بیٹھنے کو کہا اور وہ چپ چاپ وہاں بیٹھ گئی۔ اس کا نازک جسم کپکپا رہا تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔ پھر فرانسس کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

کمل! میری بیٹی! آج سے عظیم تمہارا ہے۔ تم دونوں آپس میں مل کر کوئی فیصلہ کر لو اور جب تم دونوں کا ارادہ ہوگا میں تمہاری شادی کر دونگا۔ میں تمہیں اس بات کی بھی اجازت دیتا ہوں تم جب اور جہاں چاہو عظیم کے ساتھ گھوم پھر سکتی ہو۔ تمہیں عظیم سے ملنے کی مکمل آزادی ہے۔ اس لیے کہ مجھے عظیم پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے۔ میں خوش ہوں تم نے اپنے لیے بہترین ساتھی کا انتخاب کیا ہے۔

کمل نے جواب نہ دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ تاہم اندر ہی اندر وہ خوشیوں کے بے پناہ ہجوم میں گھری ہوئی تھی۔ عظیم بھی سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ فرانسیر پھر بولا۔

اب اُٹھو بیٹی! سب کے لیے چائے لاؤ۔ ساتھ کچھ کھانے کا بھی انتظام کرلو۔ کمل اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ فرانسس اور عظیم آپس میں باتیں کرنے لگے۔



دن گذرتے رہے۔ دفتر میں دفتریت کی رنگینی اس ٹیلیفون آپریٹر لڑکی عشرت کی وجہ سے بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ صرف فرانسس اور عظیم ہی ایسی ہستیاں تھیں۔ جن پہ کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اور وہ اپنے پہلے ماحول میں ہی خوش تھے۔ عظیم کی میز پر جبکہ پہلے کوئی آیا ہی نہ کرتا تھا اب ہر وقت کوئی نہ کوئی ضرور بیٹھا رہتا تھا۔ کیونکہ عشرت کا کیبن اس کے برابر میں تھا اور وہاں بیٹھ کر اسے آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

ایک روز دس بجے کے قریب عظیم نئی خرید لی جانے والی اسٹیشنری کا اندراج رجسٹر میں کر رہا تھا کہ کسی نے اسے نہایت میٹھی اور باریک نسوانی آواز میں پکارا۔

عظیم بھائی!

عظیم نے سر اُوپر اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے عشرت کھڑی اس سے مخاطب تھی۔ عظیم کچھ کہنے والا تھا کہ عشرت پھر بول پڑی۔

ایک پنسل دے دیجئے!

علیم اُٹھا اور کیبنٹ سے پنسل نکال دی۔ پنسل تھامتے ہوئے عشرت نے بڑے پُرسوز اور دل فگار لہجے میں پوچھا۔

آپ نے اپنے آپ کو کیوں نہیں بدلا؟

علیم بدحواس سا ہوگیا۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

آپ آفس کی پہلی اور موجودہ حالت میں کوئی فرق محسوس کرتے ہیں؟

ہاں کافی تبدیلی ہے۔

اور آپ اس سے کیوں متاثر نہیں ہوتے۔

بجھی ہوئی سی آواز میں علیم بولا گھر پہ میری اپنی جوان بہن بھی ہے۔ ایسا کرتے وقت مجھے اس کا خیال بھی اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

دُکھی لہجے میں عشرت نے پوچھا۔ کیا ان لوگوں میں سے کسی کی بھی گھر پر جوان بہن نہیں ہے۔

سب کی ہونگی۔ پر اپنے اپنے سوچنے کا انداز ہے۔ اور اس بیسویں صدی کے لوگوں میں سے نوے فیصد لوگوں کا ضمیر اگر مردہ نہیں تو زنگ آلود ضرور ہو چکا ہے

تمہارے ابو کیا کرتے ہیں۔

مر چکے ہیں۔

کوئی بھائی نہیں۔

کوئی بھی نہیں۔ اس بھری دنیا میں اپنی بیوہ ماں کا میں واحد سہارا ہوں۔ پر ہمارے

اں ابھی تک کسی لڑکی کے لیے سروس کرنے کا ماحول سازگار نہیں جبکہ دوسری قومیں چاند میں نئی بستیاں آباد کرنے کی سوچ رہی ہیں۔ ہم اپنے ذہن ہی صاف نہیں کر سکے۔ اس آفس کا ماحول بھی آپ کے سامنے ہے۔ ہر کوئی غلط نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مگر فرانسس صاحب اور آپ کی موجودگی کے باعث میں اپنے آپ میں تقویت محسوس کرتی ہوں۔ اس لیے کہ فرانس ایک جوان بیٹی کے باپ اور آپ ایک جوان بہن کے بھائی ہیں اور میں وہ بدنصیب ہوں جس کا نہ کوئی باپ اور نہ بھائی ہے۔ عشرت کی آنکھوں کے کئی قطرے گر کر علیم کے سامنے میز پر بکھر گئے۔

علیم جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ چپڑاسی آیا اور نیلے رنگ کا ایک لفافہ علیم کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

آپ کا خط

علیم نے خط اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ ریحانہ کا خط تھا۔ کھول کر اس نے پڑھا اور ایکدم اداس اور افسردہ ہوگیا۔ بالکل بجھے ہوئے چراغ اور ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرح خبر نہیں کیا لکھا تھا خط میں۔ فرانسس اپنے کام میں مصروف تھے لہٰذا انہوں نے کوئی دھیان نہ دیا۔ علیم اس وقت چونکا جب بیحد میٹھی اور سریلی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

بھیا!

وہ سنبھل گیا۔ سامنے عشرت کھڑی تھی۔ کیا بات ہے بھیا!

علیم نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ٹالنا چاہا۔ فرانسس بھی اب ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اور بڑی شفقت سے پوچھا۔

کس کا خط ہے بیٹے!

امی کا

خیریت ہے نا؟

کانپتی آواز میں علیم نے کہا۔ میرے گھریلو حالات خراب ہو گئے ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی کی بیوی میری ماں اور چھوٹی بہن کو تنگ کرنے لگی ہے اور اس نے ان دونوں کا جینا مشکل اور بیزار کر دیا ہے۔ پہلے بھی ایسا ہی ایک خط آچکا ہے۔ علیم کی آواز میں ڈوب گئی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میرا چھوٹا بھائی امی سے بغاوت اور سرکشی کر رہا ہے۔

فرانسس اُٹھ کر علیم کے پاس آئے اور اس کے ہاتھ سے خط لیتے ہوئے پوچھا میں پڑھ سکتا ہوں۔

آپ سے کیا پردہ؟

فرانسس نے خط پڑھا اور افسردہ سا ہو گیا۔ پھر علیم کی بیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

تم فکرمند کیوں ہوتے ہو بیٹے! تم دو ماں بیٹی کو یہاں بلالو۔ ہمارے پاس کمرے ہیں۔ ایک تم لے لینا دوسرا ہم تینوں کے لیے کافی ہے —— علیم نے سوچتے ہوئے کہا۔

ابھی نہیں۔ میں قیصر کو خط لکھونگا۔ میں اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر جگاؤں گا۔ میں اسے بتاؤنگا جس رشتے سے وہ منہ موڑ رہا ہے وہ ایسا نہیں جسے بیوی کی ہر جھوٹی سچی مان کر کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا جائے اگر وہ سنبھل گیا تو —— تو ٹھیک۔

ورنہ میں؟ —— میں اس سے زندگی کی ہر خوشی چھین لونگا۔ اگر میں ایک شفیق باپ کی طرح اپنا خون دیکر ایک نونہال کی طرح اس کی آبیاری کر سکتا ہوں تو ایک بے رحم باغبان کی طرح اسے زہریلا پودا جان کر اسے کاٹ بھی سکتا ہوں۔

اس نے میری زندگی کو تلخ بنایا اور میں خاموش رہا۔ اپنے بڑے بھائی کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ پر میں نے زبان نہ کھولی۔ اسے چھوٹا جان کر اس کی خوشی کے آگے جھک کر اپنا آپ قربان کر دیا۔ میرے ہاتھ سے اس نے پھول چھین کر مجھے کانٹوں اُلجھا۔ اور میں اسے بھی چھوٹے بھائی کی راحت جان کر پی گیا۔

لیکن اب —— اب وہ میری ذات سے نکل کر ایک ایسی ہستی کو دکھ دے رہا ہے جسے میں نے ہمیشہ اپنی زندگی سے عزیز جانا ہے اور وہ میری ماں ہے —— ماں۔ جس کے قدموں میں میری جنت ہے ——

میں —— میں اس کی قیصر کی ہستی ہی مٹا دونگا جو میری ماں سے بغاوت اور سرکشی کر رہا ہے —— عشرت نے پانی کا گلاس لاکر اس کے سامنے رکھ دیا اور بڑی ہمدردی سے کہا۔

پانی پی لو بھیا۔ اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ علیم نے پانی کے دو گھونٹ پیتے اور

گلاس عشرت کو لوٹا دیا۔ فرانسس نے عظیم کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

جذباتی نہ بنو بیٹے! حالات ایک روز تمہارے حق میں ضرور پلٹا کھائیں گے

عظیم سنبھل گیا اور اپنے آفس کے کام میں کھو گیا۔

دو ہفتے بڑے پرسکون گزر گئے۔ عظیم نے ایک سخت خط قیصر کو لکھا جس
ابھی تک اسے کوئی جواب نہ ملا تھا۔ ایک روز عظیم آفس آیا تو فرانسس آفس سے
غائب تھے۔ حالانکہ وہ آفس ہمیشہ اس سے پہلے آجایا کرتے تھے۔ عظیم دس بجے
تک ان کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے چپڑاسی سے ان کے متعلق پوچھا پر اس نے
لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

عظیم اپنے روزمرہ کے کاموں میں کھو گیا۔ بارہ بجے کے قریب جب آفس
ڈاک آئی تو چپڑاسی اس کے میز پر دو لفافے رکھ گیا۔

آپ کا خط اور تار!

عظیم نے پہلے تار کا لفافہ جلدی جلدی کھول کر تار پڑھی۔ ریحانہ تین دن بعد تیز
سے کراچی آ رہی تھی۔ اس نے بڑی بے چینی سے دوسرا لفافہ کھولا۔ وہ ریحانہ کا خط
تھا عظیم پڑھنے لگا۔ ریحانہ، صائمہ اور عطیہ کراچی آ رہی تھیں۔ ریحانہ اور صائمہ قیصر کے
سلوک سے تنگ آکر مستقلاً عظیم کے پاس رہنے کے لیے آ رہی تھیں جبکہ عطیہ بھائی
ملنے ان کے ساتھ آ رہی تھی۔ عظیم اداس اور پژمردہ سا ہو گیا۔ تاہم دونوں لفافے جیب
میں ڈال کر وہ پھر آفس ورک کرنے لگا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد اسے ایک مانوس اور شناسا سی نسوانی آواز سنائی دی اس

چونک کر جب آفس کے گیٹ کی طرف دیکھا تو وہاں کمل کھڑی تھی اور چوکیدار سے عظیم کے
متعلق پوچھ رہی تھی۔ عظیم کھڑا ہو گیا اور اشارے سے کمل کو اپنی طرف بلایا۔ کمل تیز تیز قدم
اٹھاتی ہوئی عظیم کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ عظیم نے اپنے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

بیٹھو!

کمل بیٹھ گئی۔

عظیم نے دیکھا کمل کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ پوری
رات روتی رہی ہو۔ عظیم بڑے پیار سے پوچھا۔

کمل! خیریت ہے نا۔ تمہارے ابو آج آفس کیوں نہیں آتے۔

کمل سسک پڑی اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔ رات بارہ بجے ابو پر ہارٹ اٹیک
ہوا تھا۔ ان کی حالت نازک ہے۔ مجھے انہوں نے آپ کو بلانے کے لیے بھیجا ہے۔

عظیم بیتاب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اپلیکیشن لکھ کر اس نے چار روز کی چھٹی لی۔ کمل
کے ساتھ وہ آفس سے نکلا اور رکشے میں دونوں کیماڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔ میکلوڈ روڈ
پر گزرتے ہوئے عظیم نے کمل سے کہا۔

ڈاکٹر کو بھی نہ لے چلیں؟

بجھی بجھی آواز میں کمل نے کہا۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو ڈاکٹر ابو کا علاج
کر رہا ہے۔ میں نے اسے رات بارہ بجے ہی بلوا لیا تھا۔ وہ صبح تک ابو کی دیکھ بھال
کرتا رہا ہے اور دوائیں دے کر چلا گیا ہے۔ کہہ تو رہا تھا خطرے کی بات نہیں پر مجھے
اس کی یہ تسلی جھوٹی لگتی ہے۔

علیم خاموش رہا۔ کمل نے اس کی جیب میں رکھی تار اور خط کی طرف اشارہ کرتے ہوتے پوچھا۔ یہ تار اور خط کس کا ہے ——— علیم سمجھ گیا۔

امی کیسے ہیں ؟

کمل بیتاب ہوگئی۔ خیریت ہے نا ؟

علیم نے اور تار جیب سے نکال کر کمل کو تھما دیئے۔

پڑھ لو !

کمل نے خط اور تار پڑی اس کی حالت طوفانوں میں جڑ سے اکھڑتے ہوتے پودوں جیسی افسوسناک ہوگئی تھی۔ اس نے خط اور تار اپنے پرس میں ڈال لیے او سوچوں میں کھو گئی۔

کمل کا مکان آگیا تھا۔ علیم نے رکشے کا کرایہ ادا کیا اور دونوں مکان میں داخل ہوتے۔ دائیں طرف والے کمرے میں فرانسس بستر پر بے سدھ پڑے تھے ان کے قریب ننھی سیبل بیٹھی ان کے پاؤں دباتے ہوتے رو رہی تھی۔ کمل آگے بڑھی اور فرانسس کا شانہ پکڑ کر نرمی سے ہلاتے ہوتے کہا۔

ابو! علیم آگئے ہیں ؟

فرانسس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر علیم کی طرف عجیب سی بے چینی او ویرانی سے دیکھا۔ علیم بے کل و مضطرب ہوگیا۔ نیچے جھک کر اس نے فرانسس کا اپنے ہاتھوں میں لیکر سہلاتے ہوتے پوچھا۔

اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔

فرانسس کی نحیف سی آواز سنائی دی۔

پہلے سے افاقہ ہے۔ پھر انہوں نے علیم کا بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوتے کہا۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں رہا۔ ویسے تو ہر شخص کو ایک روز یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ لیکن میں جو پوری زندگی رزق کی تلاش میں بھٹکتا رہا ہوں۔ اطمینان اور سکون کے ساتھ اس دارِ فناہ سے کوچ کرنا چاہتا ہوں — علیم! کمل تمہاری امانت ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی میں ہی امانت اس کے مالک تک پہنچا دوں۔ تم اپنی امی کو بلاؤ۔ میں ان دنوں ہی کمل کو تم سے بیاہ دینا چاہتا ہوں۔

علیم کا سر جھک گیا تھا۔ کمل نے پرس سے ریحانہ کا خط اور تار نکال کر فرانسس کی طرف بڑھا دیئے۔

ابو! یہ ان کی امی کی تار اور خط آیا ہے۔

فرانسس نے دونوں کاغذ لے لیے۔ باری باری پڑھے۔ تھوڑی دیر دہ خاموشی سے علیم کو دیکھتے رہے جو ابھی تک ان کے سامنے سر جھکاتے بیٹھا تھا۔ پھر ان کی آواز سنائی دی۔ مدہم اور شفقت میں ڈوبی ہوتی پرسوز آواز۔

دل نہ چھوڑنا علیم! یہی سمجھ لینا کہ تم اپنے ماں باپ کے ایک ہی بیٹے ہو۔ پھر اگر ماں اور بہن کو نہیں رکھنا چاہتا نہ سہی۔ ہمارے پاس دو کمرے ہیں بیٹے اور ہر سب کے لیے کافی ہیں۔ تم آج ہی اپنا سامان جھونپڑی سے اُٹھا کر یہاں لے آؤ۔ اور ماں بہنوں کو اسٹیشن سے سیدھا یہاں لاؤ۔ یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ میری جب لاہور ٹرانسفر

ہوگئی تو میں کوشش کر کے تمہاری تبدیلی بھی وہاں کراؤنگا۔ پھر انہوں نے کمل سے کہا۔
کمل! عظیم کو دوسرے کمرے میں بھیجاؤ۔ پہلے اسے کھانا کھلاؤ۔ پھر اس کے سا
جاکر اس کا سارا سامان یہاں اٹھا لاؤ۔ کمل کے چہرے پر تشکر کے آنسوؤں میں نغمو
اور خوشیوں کا سیلاب تھا۔ اس نے بڑی بیباکی سے عظیم کا بازو پکڑ لیا۔
آیئے میرے ساتھ! عظیم چپ چاپ اُٹھ کر اس کے ساتھ ہولیا۔ کمل نے
اسے کھانا کھلایا پھر اس کے ساتھ وہ اس کا سامان لاتے ریلوے کالونی چلی گئی۔





جس روز چار بجے عظیم نے ریحانہ، عطیہ اور صائمہ کو اسٹیشن پر ریسیو کرنا تھا اسی
عظیم کمل کے ساتھ اپنی ماں اور بہنوں کے لیے شاپنگ کر رہا تھا کہ صدر بازار میں
ات کا ضمیمہ بیچنے والے زور زور سے شور کرنے لگے۔
"حادثہ! خوفناک حادثہ! تیز رو ایک ایکسپریس ٹرین سے ٹکرا گئی سینکڑوں مسافر
ے گئے۔"
عظیم پریشان ہوگیا۔ بھاگ کر اس نے ضمیمہ خریدا اور جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ کمل
پلی ہو گئی تھی اور عظیم کے ساتھ وہ بھی ضمیمہ پڑھ رہی تھی۔
عظیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ضمیمہ دہرا کرتے ہوئے اس نے دکھتے لہجے
ل سے کہا۔
کمل! چلو گھر چلیں۔ خبر نہیں میری ماں بہنوں کا کیا بنا۔ میں آج ہی اپنے گھر

روانہ ہو جاؤنگا۔ اگر میری ماں بہنوں کو کچھ ہو گیا۔ تو میں زندہ نہ رہ سکونگا۔ عظیم کی
کپکپا رہی تھی۔

کمل نے پیار سے عظیم کا ہاتھ تھام لیا۔

آئیے چلیں!

دونوں نے رکشہ لیا اور کیماڑی آئے۔ فرانسس کی حالت اب بہتر
تھی اور وہ صحن میں ایزی چیر پر بیٹھے آرام کر رہے تھے۔ گھر میں داخل
ہی کمل نے وہ ضمیمہ فرانسس کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے پڑھا اور اپنے
گھبرائے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے شفقت سے پوچھا۔

اللہ کرے تمہاری ماں اور بہن خیریت سے ہوں۔ اب تمہارا کیا ارادہ

عظیم جیسے خواب سے چونکا ہو۔ میں ابھی گھر جا رہا ہوں۔ تیز گام کی
ابھی کچھ وقت ہے میں آسانی سے اسے پکڑ لوں گا۔ فرانسس نے کمل

کمل! عظیم کی تیاری کرا دو بیٹی!

کمل عظیم کو اندر لے گئی۔ جلدی جلدی اس کے کپڑے ایک اٹیچی
اور عظیم جب اٹیچی اٹھا کر باہر نکلنے لگا تو کمل نے سو سو کے چھ نوٹ عظیم کی
بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ رکھ لیں آپ کے کام آئیں گے۔

عظیم انکار کر گیا۔ ان کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس پیسے ہیں۔ کمل
زبردستی عظیم کی جیب میں ڈال دیتے۔ آپ میری زندگی اور میری روح

پڑا اگر میں آپ کے کام نہ آؤں گی تو اور کون آئے گا۔ اس کے علاوہ میں آپ سے
کہنا بھی چاہتی ہوں۔

عظیم گویا کہیں دور سے بولا۔ کہو۔

جن حالات میں آپ یہاں سے جا رہے ہیں۔ میں نہیں جانتی ہم دوبارہ کب
ملیں گے۔ بہر حال میں آپ کو یقین دلاتی ہوں میں آپ کو بھول نہ سکوں گی۔ آپ جاتے
ہی مجھے اپنے حالات سے آگاہ کریں۔ ورنہ میں خود لاہور پہنچ جاؤنگی۔

کمل کا ہاتھ تھامتے ہوئے عظیم نے بھرپور چاہت سے کہا۔

کمل! میں تمہیں بھولنا بھی چاہوں تو نہ بھول سکونگا۔ تم میری زندگی کا سرمایہ اور سب
سے قیمتی متاع ہو۔ میرے لیے تم ایک روشن شمع ہو جس کی روشنی مجھے اپنی منزل کا پتہ
دیتی رہے گی۔

کمل کے ساتھ اٹیچی اٹھائے صحن میں آیا فرانسس سے ملا پھر وہ لمبے لمبے اور تیز
قدم بھرتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

دوسرے روز جب وہ اپنے گھر داخل ہوا تو اس نے دیکھا صحن میں دور نزدیک
کے رشتہ کی بیشمار عورتیں بھیانک اور سنسان راتوں جیسے بین کرتی ہوئی رو رہی تھیں۔
آگے بڑھا صحن میں تین پلنگ رکھے تھے۔ جن کے گرد عورتیں بیٹھی رو رہی تھیں۔ اس
نے یہ بھی دیکھا آسیہ جو اب اس سے بے پناہ محبت کرنے لگی تھی۔ اس کے بال کھلے
تھے اور دیوانہ وار وہ اپنا سر پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی۔ عظیم کو دیکھتے ہی آسیہ ٹکٹکی باندھ
کر اسے دیکھنے لگی۔ ایک طرف عاصفہ اور اس کی ماں بیٹھی رو رہی تھیں۔ عظیم آگے بڑھا

اوران تینوں پلنگوں کے اُوپر سے جب اس نے چادریں ہٹائیں تو اس نے دیکھا
ریحانہ، عطیہ اور صائمہ کی لاشیں پڑی تھیں۔ عظیم نے زخمی لہجے اور دلِ فگار آواز میں
اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے خود سے پوچھا۔

تو کیا میری ماں اور بہنیں مرگئیں ؟

قبل اس کے کوئی اس سے بات کرتا۔ کوئی اسے مخاطب کر کے اس کی ڈھارس
بندھاتا ایک طرف سے سعادت تیز تیز قدم اُٹھاتے آتے اور عظیم کو لپٹا لیا۔ عظیم کے
ہاتھ سے اٹیچی چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور وہ سعادت سے لپٹ کر بچوں کی طرح بلک
بلک کر رونے لگا۔ آسیہ چیخیں مار کر روتی ہوئی اُٹھی اور عظیم کا اٹیچی اٹھا کر اندر رکھا

دونوں چچا بھتیجا گلے مل کر رو رہے تھے اور عاصفہ انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ
تھی۔ وہ عظیم کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جن میں دُور دُور تک۔ ہمدر
اپنائیت اور کچھ کچھ پرخلوص محبت کی جھلک تھی۔ اس نے عظیم کے ساتھ اس لیے شا
سے انکار کر دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد ریحانہ کی بات مانے گا اور اس کی کوئی حیثیت
اب جبکہ ریحانہ مر چکی تھی۔ عظیم کی طرف بڑھنے کے لیے اس کے راستے میں کوئی دیوار،
رکاوٹ اور مستقبل میں اٹھنے والا کوئی طوفان نہ تھا۔ اب وہ عظیم کی طرف بڑھنے
ان پرندوں کی طرح آزاد تھی جو اطمینانیت کے ساتھ نیلی فضاؤں میں زندگی کی خو
سے بھرپور غوطے لگاتے ہیں۔ شاید ——— شاید عاصفہ کے دل میں
محبتوں کی یادیں اُٹھ کھڑی ہوتی تھیں اور ——— اور جب ایسی یاددا
طوفان اُٹھتے ہیں تو ان کے آگے بند تھوڑا ہی باندھا جا سکتا ہے۔ وہ انسانی شخ

کے ہر پہلو کو بہا کر لیجاتے ہیں۔ سعادت سے علیحدہ ہو کر عظیم اپنی ماں کے پلنگ سے
لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اس کے ایک طرف قیصر بھی بیٹھ کر آنسو بہا رہا تھا۔

شام سے ذرا پہلے جنازے کی تیاری شروع ہوئی۔ شاید عظیم کا ہی انتظار کیا جا
رہا تھا۔ عظیم نے ہر کام میں کسی خودکار مشین کی طرح حصہ لیا۔ ابھی تک اس نے کسی سے
بات نہ کی تھی۔ آسیہ نے کئی بار اسے مخاطب کیا۔ پر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سعادت
نے بار بار اسے جھنجھوڑا مگر عظیم پھر بھی نہ بولا۔

تینوں ماں بہنوں کو اپنے ہاتھوں سے مٹی تلے دفن کرنے کے بعد عظیم جب
گھر لوٹا تو سعادت اسے اپنے ہاں لے گئے۔ سعادت اور آسیہ نے اپنی سی پوری
کوشش کی کہ عظیم کسی سے بات کرے پر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ سعادت اٹھ کر
جب اسے کوئی انجکشن دینے لگے تو اسی وقت اچانک باہر برآمدے میں قیصر
گزرا۔ وہ باہر سے آتے ہوئے مہمانوں کو کھانا کھلانے کی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اسے
دیکھتے ہی عظیم کسی زخمی درندے کی طرح دھاڑا۔

ٹھہرو قیصر!

قیصر ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔ عظیم طوفان کی طرح اٹھ کر باہر آیا۔ سعادت اور آسیہ
بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ قیصر کے پاس آکر عظیم نے زہریلے لہجے میں کہا۔

تم ——— تم میری ماں اور بہنوں کے قاتل ہو ——— ذلیل انسان تم
تین بناتِ آدم کی موت کے ذمہ دار ہو۔ نہ تنگ کر کے تم انہیں گھر سے نکالتے اور
نہ وہ اس حادثے کا شکار ہوتیں۔ عظیم آگے بڑھا اور قیصر کا گریبان پکڑ لیا۔

ذلیل کمینے! بے شرم بے حیا! میں تمہیں زندہ نہ چھوڑونگا۔ عظیم نے اپنا دایاں فولادی ہاتھ اٹھا کر کے قیصر کے منہ پر دے مارا۔ قیصر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ سب لوگ بھاگے ہوئے وہاں آ جمع ہوتے تھے۔ ان میں عاصفہ بھی۔ اس نے آگے بڑھ کر قیصر کی حمایت نہ کی۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ حالانکہ وہ اس کا شوہر تھا۔

عاصفہ کو دیکھتے ہی عظیم نے دو بھرپور طمانچے اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا سب سے بڑی ڈائن تم ہی — تم ہی وہ ہو جس نے اس گھر میں خاک اڑا دی ہے قیصر بھی اب آپے سے باہر ہو گیا تھا اور آگے بڑھ کر اندھا دھند عظیم پر مکے برسانے لگا تھا لیکن عظیم کے سامنے اس کی حیثیت یوں تھی گویا بھیڑیے کے آگے کمزور دا لومڑ۔ عظیم نے آناً فاناً قیصر کو نیچے گرا لیا۔ پھر اس کی چھاتی پر سوار ہو کر وہ بڑی طرح مارنے لگا۔ سعادت اور آسیہ نے اسے پکڑ کر قیصر کے اوپر سے اتارنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ عظیم زور زور سے چلا رہا تھا۔

چھوڑ دو مجھے! میں اسے زندہ نہ چھوڑونگا۔ یہ قاتل ہے اپنی ماں اور بہنوں

سعادت آسیہ اور کچھ دوسرے لوگوں نے مل کر عظیم کو زبردستی کھینچ کر علیحدہ کیا۔ پر وہ ان کی گرفت سے نکل کر پھر قیصر پر سوار ہو گیا تھا۔ اسی بار اس کے دونو ہاتھ قیصر کی گردن پر پڑے تھے۔

قیصر! تمہیں اب جینے کا کوئی حق نہیں۔

سب لوگوں نے مل کر ایک بار پھر عظیم کو علیحدہ کیا۔ وہ زور زور سے چلا تھا اور جو لوگ اسے پکڑے ہوئے تھے انہیں مار رہا تھا۔

چھوڑ دو مجھے! تم سب قاتل ہو۔ میں کسی کو نہ چھوڑونگا۔ تم لوگوں میں کوئی بھی انسان نہیں۔ میں سب کا خون کر دونگا — ہا ہا ہا ہا۔ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ پاگل ہو گیا تھا بیچارہ۔

سب لوگوں نے بڑے جتن اور کوشش کے بعد اسے صحن کے اندر ایک درخت کے ساتھ رسیوں میں جکڑ دیا تھا۔ آسیہ اس کی حالت پر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ سعادت نے اسے انجکشن دے کر بے ہوش کر دیا۔ پھر ایک کمرے میں بستر پر ڈال دیا گیا اور وہ کمرہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔

دوسرے روز کسی کی ہمت نہ پڑ رہی تھی کہ وہ کمرہ کھول کر عظیم کے پاس جاتے کوئی بھی اس کیلئے ناشتہ لیجانے کو تیار نہ تھا۔ آخر سعادت خود تیار ہوتے انہوں نے ناشتے کے ساتھ ایک انجکشن اور عظیم کو کھلانے کے لیے کچھ ٹیبلٹس لیں اور اس کمرے کی طرف بڑھے۔ آسیہ جو ان کے قریب سوچوں میں کھڑی تھی۔ بھاگ کر آگے بڑھی اور سعادت سے ناشتے کی ٹرے لیتے ہوئے اس نے کہا۔

ابو! میں خود انہیں ناشتہ کراؤنگی۔ مجھے امید ہے۔ وہ مجھے نہیں ماریں گے وہ بیشک اپنے حواس میں نہیں اس کے باوجود میرا دل کہتا ہے۔ وہ ضرور میرا خیال رکھیں گے۔ کچھ لوگ احتیاطاً اس کمرے کے باہر کھڑے ہو گئے۔ سعادت اور آسیہ اندر داخل ہوئے۔ عظیم اپنے بستر پر سویا ہوا تھا۔

آسیہ نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ کر عظیم کو جگایا۔ عظیم دونوں باپ بیٹی کو یوں گھورنے لگا تھا جیسے وہ دونوں اس کے لیے اجنبی ہوں۔

آسیہ نے اس کے ان تیوروں کی پرواہ نہ کی پہلے اس کے ہاتھ اور منہ دھلایا پھر اپنے ہاتھ سے لقمے بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ عظیم نے واقعی اسے کچھ نہ کہا تھا اور اس کے ہاتھ سے ناشتہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد سعادت نے اسے انجکشن دیکر ٹیبلٹس کھلوائیں دونوں باپ بیٹی قدرے مطمئن انداز میں کمرے سے نکلے اور دروازہ پہلے کی طرح باہر سے لاک کر دیا گیا۔

عظیم بیچارہ پاگل ہو گیا تھا۔ اور سعادت دن رات محنت کر کے اس کا علاج کرنے لگے تھے۔ آسیہ یوں اس کی خدمت کر رہی تھی گویا وہ اس کی منگیتر اور منسوبہ نہیں اس کی بیوی ہو۔



پاگلوں کی حالت میں اس کمرے کے اندر بند عظیم کو کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ سعادت خود اس کا علاج کر رہے تھے اور اب کافی حد تک وہ اپنا ذہنی توازن بحال کر چکا تھا۔

ایک روز صبح ہی صبح کمل سیاہ رنگ کا ایک اٹیچی اٹھائے عظیم کے گھر داخل ہوئی۔ قیصر اور عاصفہ دونوں اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔ لہٰذا مکان کے سارے کمروں کو تالا لگا ہوا تھا۔ کیونکہ اب اس مکان میں قیصر اور عاصفہ ہی رہ رہے تھے۔ عظیم بیچارہ سعادت کے ہاں ایک کمرے میں بند تھا۔ قیصر کبھی اسے ملنے نہ گیا تھا۔ پر عاصفہ اس سے چوری چوری کھڑکی میں سے عظیم کو ضرور دیکھا کرتی تھی۔

کمل پریشانی میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے سعادت کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ وہ عظیم کے مکان کی طرف آئے اور کمل کو پکارا۔

کس سے ملنا چاہتی ہو بیٹی!

کمل نے لرزتی اور ہچکچاتی آواز میں کہا۔

مجھے عظیم سے ملنا ہے۔

کہاں سے آئی ہو؟

یہیں لاہور سے

عظیم کو کیسے جانتی ہو۔

ہم پہلے کراچی تھے۔ میرے ابو بینک میں ہیں اب ان کی یہاں ٹرانسفر ہوگئی بلکہ عظیم بھی وہاں اسی بینک میں تھے اور ہمارے گھر ہی رہتے تھے۔

تمہارا نام کیا ہے بیٹی!

میرا نام کمل ہے۔

کیا تم جانتی ہو عظیم پر کیا گزری۔

تھوک نگلتے ہوئے کمل نے مغموم آواز میں کہا۔

میں وہی تو پوچھنے آئی ہوں؟

تو سنو میری بیٹی! ٹرین کے حادثے میں اس کی ماں اور دونوں بہنیں مرچکی ہیں۔ وہ خود پاگل ہوچکا ہے۔ اور میرے مکان کے ایک کمرے میں بند ہے۔

میں اس کا انکل ہوں۔ میرا نام سعادت ہے۔ میں ـــــ سعادت ایک دم خاموش ہوگئے۔ کمل کے ہاتھ سے اٹیچی چھوٹ کر زمین پر گرا۔ پھر وہ بری طرح چکرائی اور بے سدھ سی ہوکر زمین پر گر گئی۔ سعادت نے زور سے پکارا۔

آسیہ! آسیہ!

آسیہ اپنے کمرے سے بھاگتی ہوئی نکلی۔ کیا ہوا ابو جی!

اس لڑکی کو سہارا دے کر اٹھاؤ بیٹی۔ خود وہ آگے بڑھے اور اٹیچی اٹھالیا آسیہ نے کمل کو اٹھا کر اپنی گود میں لیتے ہوئے پوچھا۔

یہ کون ہے ابو جی!

اس نے اپنا نام کمل بتایا تھا بیٹی۔ یہ عظیم سے ملنے آئی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ کراچی میں عظیم ان کے ہاں رہتا تھا۔ میں جب اسے بتایا کہ عظیم کی ماں اور بہنیں مرگئی ہیں اور خود وہ پاگل ہوچکا ہے تو یہ غش کھا کر گر گئی۔ ٹھہرو میں اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرتا ہوں۔

سعادت اٹیچی کو کوریڈور میں رکھ کر پانی کا گلاس بھر لائے اور کمل کے منہ پر چھینٹے دیئے۔ کمل نے آنکھیں کھول دیں اور بیتاب ہوکر سعادت سے پوچھا۔

کیا آپ مجھے عظیم سے ملا دیں گے۔

بیٹی! اس کا ذہن ابھی پوری طرح سنبھال نہیں ہوا۔ جو بھی اسے ملنے کی کوشش کرتا ہے وہ اسے مارتا ہے۔

کمل آسیہ کی گود سے نکل کر کھڑی ہوگئی۔ اگر وہ مجھے جان سے بھی ماردیں تو میں سمجھونگی مجھے میری منزل مل گئی ہے۔

سعادت اپنے مکان کی طرف بڑھے۔ آؤ میرے ساتھ ـــــ کمل ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ آسیہ تھی ـــ سعادت نے ایک کمرے کی کھڑکی کھولی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوتی تھیں۔ کمل نے دیکھا اندر ننگے فرش

پر علیم سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کمل نے سعادت سے کہا۔

کیا آپ اس کمرے کا دروازہ نہ کھولیں گے۔ میں اندر جا کر ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ اگر اس نے تم پر ہاتھ اٹھایا تب ——— آپ بے فکر رہیں مجھے امید ہے وہ مجھے پہچان لیں گے۔

سعادت نے دروازہ کھولا۔ اور کمل بلا جھجک اندر داخل ہو گئی۔ سعادت اور آسیہ بھی احتیاطاً کمرے کے اندر کھڑے ہو گئے تھے۔ علیم کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کمل نے اپنی رسیلی آواز میں کہا۔

علیم! علیم!

علیم نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں کیسی ویران اور ملال بھری تھیں۔ اس کے چہرے پر شام کے تاریک ماتمی سایوں جیسی اداسی تھی۔ کمل نے دیکھا ذہنی مفلسی کا شکار ہو کر علیم کا چہرہ کیسا مٹیالا اور سوکھا سا ہو گیا تھا۔ علیم جب پھٹی پھٹی نگاہوں سے کمل کو گھورتا رہا تو کمل رو پڑی اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

علیم! مجھے پہچانا تو۔ میں کمل ہوں۔

علیم کھڑا ہو گیا اور کمل کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

تم کب یہاں آئی ہو؟

اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کمل نے کہا۔ ابو کی ٹرانسفر یہاں ہو گئی ہے اور ہمیں یہاں آتے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔

تمہارے ابو کیسے ہیں۔

اکثر بیمار رہتے ہیں ـ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ وہ ضرور میرے ساتھ آتے ن ان دنوں وہ پھر دل کے شدید اٹیک میں مبتلا ہیں۔

اچانک علیم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس پر دحشت، بربریت چھانے لگی۔ پھر ا کی مٹھیاں بھینچنے لگیں جیسے اسکا جسم بری طرح اینٹھ رہا ہو۔ سعادت نے کمل پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

باہر نکل آؤ بیٹی! تمہارے باپ کی بیماری کا سن کر علیم کی حالت بگڑ رہی ہے۔ اس کی یہ حالت خطرناک ہے۔ کمل نے سعادت سے اپنا آپ چھڑا لیا اور بھاگ کر م کی لشت سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے کہا مجھے آپ کی ا اور بہنوں کے مرنے کا دکھ ہے۔ میں آپ کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی جس لت میں آپ اس کمرے کے اندر بند ہیں۔

علیم اب بالکل نارمل دکھائی دینے لگا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے ٹے موٹے آنسو۔ ساون بھادوں کی موسلا دھار بارش کی شفاف بوندوں کی رح ———

کچھ دیر تک وہ دونوں اسی طرح کھڑے آنسو بہاتے رہے پھر کمل علیم کے سامنے ئی اور اپنی ساڑھی کے پلو سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

میں آپ کا دوسرا اٹیچی لائی ہوں۔ اس میں آپ کے سارے کپڑے بھی ہیں پھر ل نے علیم کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا

آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟

عظیم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کمل اپنا منہ عظیم کے کان پہ لے گئی اور سرگوشی کی۔

آپ کو دولوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لیں۔

عظیم کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی اور دھیمی آواز میں اس نے ک
نہیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ کمل پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔ میں اب ہر روز آپ
ملتی رہونگی۔

کمل، سعادت اور آسیہ سے کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی اور دروازہ ا
نے پہلے کی طرح لاک کر دیا۔ کمل نے سعادت سے کہا۔

مجھے اب اجازت دیجئے؟ ——— آسیہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو
لیا۔ تھوڑی دیر بیٹھو چائے پی کر جانا ——— کمل نے غور سے آسیہ کی طرف د
ہوتے پوچھا۔ آپ عظیم کی کیا لگتی ہیں۔

آسیہ کے بجائے سعادت بولے۔

یہ میری بیٹی ہے۔ اس کا نام آسیہ ہے اور یہ عظیم کی منگیتر بھی ہے ——— ک
کانپ گئی۔ اس کا رنگ پھولی ہوئی سرسوں جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی حالت
تھی گویا اچانک اس پر کسی نے کھولتا ہوا پانی انڈھیل دیا ہو۔ اس کے چہرے
کئی رنگ اُڑ رہے تھے جیسے تیز طوفانوں میں کشتی کے بادبان پھڑ پھڑا گئے۔

آسیہ نے اسے چونکا دیا۔

آیئے میرے ساتھ؟

کمل نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ میں پھر کبھی آپ کے پاس بیٹھونگی۔
وقت مجھے جلدی ہے۔ میرے ابو سخت علیل ہیں اور میرے سوا کوئی اُن کی
بھال کرنے والا نہیں۔ کمل واپس مُڑی اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

عظیم سے ایک بار ملنے کے بعد کمل ایسی غائب ہوئی کہ دوبارہ اسے ملنے
نہ آئی۔ شاید یہ سن کر کہ آسیہ عظیم کی منسوبہ ہے۔ اس کی نسوانیت کے وقار کو
دھکا لگا تھا۔ اس کی ذہنی رفعت اس انکشاف سے زمین کی سرو پاتال میں اُتر گئی
۔ بڑے ست سبھاؤ کے ساتھ عظیم سے ملنے والی کمل سر دی وجود کا پر تحیر راز
ئی تھی۔ اس کی زندگی کے گیتوں کی بازگشت جو اس سے چھین لی گئی تھی۔

چند ہفتے اور سعادت کے زیر علاج رہنے کے بعد عظیم ذہنی طور پر تندرست
یا تھا لیکن عظیم وہ پہلے جیسا عظیم نہ رہا تھا اس نے اپنے آپ کو تنہائی اور
فراموشی میں ملفوف کر لیا تھا۔ اسے کمل کی تلاش تھی لیکن وہ تو اپنا پتہ بتائے
وں غائب ہو گئی تھی جیسے کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی ہو۔ اسے ذہنی سکون اور
دگی چاہیئے تھی جو اسے میسر نہ تھی۔ ریحانہ بچاری زندہ ہوتی تو شاید اسے سنبھال
لیکن وہ تو ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی تھی۔ آسیہ لاکھ اُس کی دلجوئی کرتی۔ پر وہ
کہاں۔ عظیم کو آسیہ سے کوئی رغبت کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پر وہ معصوم لڑکی اپنے
م کے ہر تار سے قربان ہو رہی تھی۔ قیصر نے عظیم سے ملنا ترک کر دیا تھا اس
فہ کا دل ضرور چاہتا تھا کہ وہ اس عظیم کا قرب حاصل کرے جواب ماں کی
ت سے آزاد تھا۔ لیکن وہ اس خوف کے باعث عظیم کے قریب نہ آتی تھی کہ

عظیم مارے گا ـــــ

یوں عظیم اکیلا ہی اکیلا اندر ہی اندر سلگتا اور چٹختا رہا کوئی اس کے دل کا حبۃ
درد والم، ذہن کا تحیر۔ اس کے باطن کا شور و شر اس کی آنکھوں کی حسرت، ا
کی کلپنا اور اس کی بے لبی اور شکستگی نہ جان سکا۔ آسیہ گو چوبیس گھنٹے اس کے
ساتھ بندھی رہتی تھی لیکن اس کی کرب آشنا روح کا سکون نہ بن سکی اور
اس کے ذہن میں حسرت دیاس کا اندھیرا اپنے پورے زہریلے پن کے سا
پھیلتا رہا اور اس کے اسی ذہنی اور نفسیاتی دباؤ نے اسے خدا کا منکر بنا دیا
پر اس کا اعتقاد یکسر جاتا رہا تھا اور وہ سرِ عام لوگوں کے ساتھ خدا کے خلاف
لگا۔ اس خدا کے خلاف جس نے زمین و آسمان کی بساط بچھا کر انسان کو اس کا ا
بنا دیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بیسویں صدی کا انسان جو فرزند ازل و ابد ہے گ
ہوئی انسانی نسلوں کی خاک اڑاتا ہوا بڑی تیزی سے جہنم کے کثیف دھندلک
کی طرف بھاگ رہا ہے ۔



وہ رات، سرد، ویران اور تاریک تھی۔ پچھلے پہر کا زرد چاند غروب ہو چکا تھا۔
ے ننھے ستارے آسمان پر جزیروں کی طرح تیر رہے تھے۔ ستاروں کی قرمزی اور
زردی لہریں سنسان اور ژولیدہ فضاؤں میں کھو گئی تھیں۔ سعادت کے
ا ایک ہی کمرے میں عظیم، آسیہ اور سعادت سوئے ہوئے تھے۔
عظیم نے کروٹ بدلی پھر سر اُٹھا کر سعادت اور آسیہ کی طرف دیکھا دونوں
ری نیند سوئے ہوئے تھے وہ بڑی آہستگی سے اُٹھا چپل پہنی اور بے آواز
ل کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ لان میں آکر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا
باہر نکل گیا۔ اور ریلوے سٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر چل نکلا۔ رات
، سناٹے میں سرد اور تیز ہوائیں نیچر کے مغموم گیت گا رہی تھیں جیسے
ے کھوکھلے سرکنڈے کی بانسری کے زخمی سینے سے سرمست آہوں کی آوازیں

ابھر ڈوب رہی ہوں۔ وہ چلتا رہا کہیں رکے اور قیام کیے بغیر۔

وہ سیدھا ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے آیا اور لکڑی کے اس بنچ پر بیٹھ
جہاں پہلے سے ایک بوڑھا اور لاغر مرد بیٹھا اونگھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا،
مسافر تھا۔

عظیم جب بنچ پر بیٹھ گیا تو اس بوڑھے نے سر گھما کر چند لمحوں تک غور سے
دیکھا پھر سوالیہ انداز میں پوچھا۔

کہاں جاؤ گے میاں!

عظیم نے بے اعتنائی سے کہہ دیا —— کہیں نہیں۔

کہاں رہتے ہو؟

یہیں لاہور میں۔

پھر گھر سے کیوں نکلے ہو۔

سلگتی ہوئی آواز میں عظیم نے کہہ دیا۔ خدا کو تلاش کرنے۔

بوڑھا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کیا تمہیں یقین ہے تم خدا کو تلاش کر لوگے۔
الٹا اس سے سوال کر دیا۔

تمہارے خیال میں مجھے خدا کو کہاں تلاش کرنا چاہیئے۔

اگر خدا کو ڈھونڈنا ہی ہے تو وہ تمہیں مسافر خانے کی اس لکڑی کی زنج
ملیگا۔ جاؤ اسے مکتبوں، مدرسوں، مسجدوں اور معبدوں میں تلاش کرو۔
نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا۔

مکتبوں اور مدرسوں میں؟ جہاں تعلیم تجارت اور عمارتیں سیاست دانوں کی
یک آماجگاہیں بن گئی ہیں۔ مسجدوں اور معبدوں میں؟ جہاں صرف وہ لوگ جاتے
، جو بے آسرا و بے مایہ ہیں اور خدا پر اندھا اور اٹل یقین رکھ کر اسے اپنا مددگار رو
نظ جان کر اس کی خوشنودی حاصل کرنے جاتے ہیں۔

بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا۔ عظیم وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہر کی مسجدوں میں
ی اذانیں ہونے لگیں تھیں۔ سردی تیز ہو گئی تھی۔ وہ ایک تھرڈ کلاس اور ایک دم
م ہوٹل میں داخل ہوا اور چائے پینے کے ساتھ ساتھ دہکتی ہوئی کوئلوں کی
ی کے پاس بیٹھ کر اپنے آپ کو گرم بھی کرنے لگا۔

دوسرے روز سہ پہر تک وہ یوں ہی شہر میں بے مقصد گھومتا رہا۔ ایک مسجد
سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رکا۔ سر جھکا کر کچھ سوچا۔ پھر مسجد میں
ل ہوا۔ اندر کوئی باریش بزرگ عبادت کر رہے تھے۔ شاید مسجد کے امام ہونگے۔
ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ جب وہ عبادت سے فارغ ہوئے تو عظیم نے
سے پوچھا۔

مجھے خدا کی تلاش ہے۔ کیا آپ میری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟

اس بزرگ نے ایک بار گہری مگر غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر کسی قدر ٹھہرے
ے لہجے میں کہا۔

خدا تو ہر جگہ موجود ہے۔ آسمانوں میں۔ زمین کی سطح سے پاتال تک، نیلی فضاؤں
ہ تو ہر جگہ موجود ہے۔ یہ سمندروں کی غراتی ہوئی لہریں، نیلی فضاؤں میں تیرتے

ہوتے طیور، یہ اشجار و نجوم، بادل اور برق کی روشنی ـــــ یہ پہاڑوں
نکلنے والے اور میدانوں میں بہہ کر سمندر میں گرنے والے پانی کے دھارے سد
اس کے وجود کی نشانیاں ہیں پر اس کے لیے جو عقل و شعور رکھتا ہو۔

عظیم نے پھر پوچھا۔ کیا اسے اپنے سرمدی راز رکھنے والے وجود سے با
دیکھا جا سکتا ہے۔

وہ بزرگ تلملا گئے۔

تم انہونی باتیں کرتے ہو۔ اگر تمہیں خدا کی تلاش ہے تو جاؤ پہلے اپنے آپ کو
قابل بناؤ کہ وہ تم پر اپنے سارے سربستہ راز عیاں کر دے۔

کیا آپ مجھے کسی ایسے شخص کے متعلق بتا سکتے ہیں جو اپنے لیے ان سربستہ را
کو عیاں کر چکا ہو۔

انہوں نے پھر خفگی میں کہا۔ تم گمراہ بھٹکے اور حالات کے ستاتے ہوتے دکھ
دیتے ہو۔ جاؤ خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگو۔ وہ یقیناً تمہاری راہنمائی کرے گا۔

وہاں سے نکل کر عظیم ایک کلیسا میں داخل ہوا۔ اندر ایک پادری سفید کپڑے
پہنے اور گلے میں سنہری صلیب لٹکائے گرجے کی صفائی کر رہا تھا۔

عظیم کو دیکھتے ہی پادری نے پوچھا۔

تم کون ہو اور کس لیے آتے ہو؟

عظیم نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ کر مقدس مریم کے بت کو دیکھنے لگا۔
نے پھر پوچھا۔

کس لیے گرجے میں آتے ہو؟

عظیم نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔ خدا کو ڈھونڈھنے۔ پادری شش و پنج
میں پڑ گیا۔ عظیم آگے بڑھ کر عیسیٰ علیہ السلام کے اس بت کو دیکھنے لگا جو آبنوس کی چمکدار
صلیب پر لٹک رہا تھا۔ پادری کی طرف دیکھتے ہوتے عظیم نے پوچھا۔

تم کب تک اپنے پیغمبر کو صلیب پر لٹکائے رکھو گے؟

پادری نے بڑے ٹھہرے ہوتے لہجے میں جواب دیا۔ جب تک یہ دوبارہ
انسانیت کی بھلائی کے لیے نزول نہیں کرتے۔

عظیم نے کچھ سوچا پھر باہر نکل گیا۔ اس کا رخ گوالمنڈی کی طرف تھا وہ چلتا رہا۔ سورج
غروب ہو چکا تھا۔ لمبی کالی سیام اور سرد رات اپنے پنکھ پھیلا چکی تھی وہ شاید گھر
واپس نہ جانا چاہتا تھا۔ اس لیے کسی ٹھکانے کی تلاش میں تھا۔ جہاں وہ رات بسر کر سکے

مغلیہ دور کی ایک پرانی پونما عمارت کے سامنے وہ رک گیا جس کے وسط میں
چھوٹا سا ایک مندر تھا۔ شاید وہ عمارت کبھی دھرم سالہ رہی ہو گی۔ دو منزلہ عمارت
تھی اور نیچے اوپر چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوتے تھے۔

وہ عمارت کے اس گیٹ سے جو کسی بیوہ کی مانگ کی طرح کھلا اداس اور بغیر
دروازے کے تھا اندر داخل ہو گیا۔ کمروں کے اندر بجلی کے بلبوں کی روشنی چھن چھن سے
نکل رہی تھی۔ وہ عمارت کے وسیع آنگن میں مندر کے سامنے آ کھڑا ہوا اور حالات
کا جائزہ لینے لگا۔ مندر کے سامنے ہاتھ سے کھینچی جانے والی ایک ریڑھی کھڑی تھی۔
ذرا دائیں [illegible] املتاس کا درخت یوں کھڑا تھا جیسے برسوں سے وہ یہاں کے مکینوں

کی بے بسی اور لاچاری دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہو۔

وہ مندر کی طرف آگے بڑھنے لگا تھا کہ رُک گیا۔ عمارت میں ایک لاغر اور دُبلا پتلا کتا داخل ہوا وہ اپنے منہ میں دو خشک روٹیاں اٹھاتے ہوئے تھا۔ املتاس کے خاکستری تنے کے پاس آکر کُتّے نے روٹیاں رکھ دیں۔ چند لمحوں تک غور سے عظیم کو دیکھتا رہا۔ پھر دو چار بار بھونکا اور یوں مطمئن ہو کر کہ اسے کوئی خطرہ نہیں وہ املتاس کے خاکستری تنے کے پاس گڑھا کھود کر دونوں خشک روٹیاں زمین میں دبانے لگا شاید وہ کہیں سے پیٹ بھر آیا تھا۔ اور وہ دو روٹیاں اپنے آڑے وقت کے لیے محفوظ کر رہا تھا۔

عظیم کُتّے کی حرکات کو غور سے دیکھتا رہا۔ ایکدم وہ چونک پڑا۔ رات کے گہرے سناٹے میں مندر کے اندر سے گانے بجانے کی آوازیں سنائی دی تھیں وہ آگے بڑھا اور چاند کی روشنی میں دیکھا مندر دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ تاریک تھا زندان کی کسی سیلی کوٹھڑی کی طرح۔ دوسرے کمرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی اس نے کھڑکی کے نیم وا پٹ سے اندر دیکھا۔

ایک بوڑھا آدمی جو شکل و صورت سے ہندو لگتا تھا۔ دیوار کے ساتھ بیٹھا ہارمونیم بجاتے ہوئے گا رہا تھا۔ اس کے سامنے دائیں طرف ایک معصوم سا لڑکا بیٹھا ڈھولک بجا رہا تھا اس کی عمر بارہ برس کے قریب ہوگی۔ بائیں طرف تیرہ چودہ برس کی تیکھے نقوش والی ایک حسین لڑکی بیٹھی تھی اس کا سر جھکا ہوا تھا جیسے وہ بوڑھے کا گانا سننے میں محو ہو۔ لڑکی اور لڑکے کی شکل آپس میں ملتی تھی۔ شاید بہن بھا

ہوں گے —

عظیم وہاں کھڑا ہو کر انہیں سننے لگا۔ بوڑھا گا رہا تھا۔

میرے ہمدمو! میرے رفیقو!

قبل اس کے مسجدوں میں اذان ہو اور کوزہ گر اپنے چاک کو حرکت دیں قبل اس کے کہ طویل شب کی بیداری کے بعد راہب اُٹھیں اور عبادت کی گھنٹیاں بجائیں —

میرے ساتھیو! میرے چارہ گرو!

اس سے پہلے کہ مچھیرے اپنی کشتیوں کے بادبان کھول دیں۔ اس سے پہلے کہ سورج کی تپتی شعاعیں عدم کی آتشی خوشبو لیکر چاروں طرف بکھر جائیں۔ اس سے پہلے کہ فطرت کے ہاتھ تخلیق اور فنا کے لیے اُٹھیں۔ اور اس فانی جہاں میں خوشی اور ماتم کے گیت سنائی دیں۔ اُٹھو ہم محنت کر کے اپنے لیے امن و سکون کے جزیروں کی تلاش کریں۔ ورنہ غربت کے شعلے اپنی آگ اُگلتی زبانیں نکالے۔ ہماری طرف بڑھ کر ہمیں خاکستر کر دیں گے۔

میرے دستو! میرے رفیقو!

بلند و بالا خیالات کی شکنیں توڑ کر ہم اپنے لیے سوکھی روٹی اور باسی سبزی کا سامان کریں۔ میرے فرزندو! آؤ مل کر دنیا کی ابتدا اور آغاز کے گیت گائیں اور ظلمت میں اپنے لیے نور کی تلاش کریں۔ اگر ہم اکناف عالم میں پھیل کر اپنے لیے محنت و کشمکش کریں تو تاریک رات ایک ماں کی طرح ہمارا ساتھ دیگی۔

آؤ۔ آؤ دوستو! محنت کشی اور علو ہمتی کے ساتھ آپس میں روحی مفاہم
کرکے ہم انسانیت کو گرسنگی کے گڑھوں اور قنوطیت کے نشیب سے نکالیں
اچانک وہ بوڑھا گاتے گاتے خاموش ہوگیا۔ اس نے کھڑکی میں کھ
علیم کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ ہارمونیم پر رک گئے تھے اور اس کی طرف دیک
ہوئے ڈھولک بجانے والے لڑکے کے ہاتھ بھی ساکن ہوکر رہ گئے۔ لڑکی نے چو
کر سر اوپر اُٹھایا اور سوالیہ نگاہوں سے کبھی بوڑھے اور کبھی اپنے چھوٹے بھ
کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

علیم وہاں سے ہٹ کر املتاس کے تنے کے پاس آ بیٹھا۔ اس کے قریب
وہ کتا بیٹھا تھا جس نے وہاں روٹیاں دبائی تھیں۔ علیم سخت سردی اور بھوک محسو
کر رہا تھا۔ اس نے زمین کھود کر وہ دونوں روٹیاں نکال لیں جو کتے نے دفن
تھیں۔ مندر کے اندر گانے والا بوڑھا، لڑکا اور لڑکی تینوں باہر کر اس رہڑی ک
پاس کھڑے ہوگئے تھے جو مندر کے سامنے کھڑی تھی اور بڑے غور سے علی
کو زمین کھودتے ہوتے دیکھنے لگے تھے۔

ان کے دیکھتے ہی دیکھتے علیم نے دونوں روٹیاں نکال لیں۔ انہیں جھا
اور وہیں بیٹھ کر انہیں چبانے لگا۔ کتا غصے میں کھڑا ہوگیا تھا اور زور زور
بھونک کر اپنا حق چھن جانے پر بھونکنے لگا۔ علیم نے اسے دو ایک با
پچکار کر بلایا۔ کتا خاموش ہوگیا اور علیم کے قریب ہوکر دم ہلانے لگا۔ علیم
تیزی سے خشک روٹی چبانے لگا جیسے برسوں کا بھوکا ہو۔

وہ بوڑھا جو بیساکھیوں کے سہارے چل رہا تھا آہستہ آہستہ علیم کی طرف بڑھا
کے پیچھے وہ لڑکا اور لڑکی بھی تھے۔ علیم کے پاس آکر اس بوڑھے نے پوچھا۔
اے نوجوان! تم کون ہو؟
تیزی سے خشک روٹی چباتے ہوئے علیم نے جواب دیا۔ انسان ہوں اور خدا
تلاش میں نکلا ہوں۔ لیکن وہ مجھے کہیں نہیں ملا۔
اس بوڑھے کا سر تھوڑی دیر کو جھکا پھر وہ گھمبیر سی آواز میں بولا۔
کیا تم نہیں مانتے کہ تم بھوکے تھے اور اسی خدا نے تمہیں اس درخت کے
سے دو روٹیاں مہیا کیں تاکہ تم اپنی زندگی کی ڈور پکڑے رہو۔
یہ تو میں نے اس کتے کا حق چھینا ہے اور ایک روز میں اسے اس کا صلہ
رور دوں گا۔
تمہارا نام کیا ہے؟
علیم!
کہاں رہتے ہو؟
میرا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔
بوڑھا شفقت سے بولا۔
باہر سردی ہے۔ اندر آجاؤ۔
روٹی کا آخری ٹکڑا چباتے ہوئے علیم نے کہا۔
تمہارے پاس بیٹھ کر مجھے دیر ہوجائے گی جبکہ مجھے یہ سرد رات گزارنے

کے لیئے ابھی کوئی ٹھکانہ بھی تلاش کرنا ہے ۔

ہم تینوں اس مندر میں رہتے ہیں۔ تم بھی اسے اپنا ٹھکانہ سمجھو اور یہیں جاؤ۔ کیا تم مجھے یہاں سے نکال تو نہ دو گے؟ نہیں یہاں تم میرے بیٹے بن کر بوڑھے نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا آؤ میرے ساتھ۔

وہ تینوں عظیم کو لے کر مندر کے اسی کمرے میں داخل ہوئے۔ عظیم نے کمرے کے اندر تین چارپائیاں لگی تھیں۔ اور دائیں طرف کچھ جگہ خالی پڑی جہاں ہارمونیم اور ڈھولک پڑے تھے۔ ان تینوں کے ساتھ ایک بستر پر بیٹھتے ہوئے عظیم نے پوچھا۔

تم تینوں اس مندر میں کیوں رہتے ہو۔

بوڑھا اس کے سامنے بیٹھتا ہوا بولا۔ میرا نام شیام کمار ہے لیکن اکثر مجھے شامو ہی کہتے ہیں۔ میں جیکب آباد کا رہنے والا ہوں۔ پھر اس نے لڑکے اور لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ آفتاب اور رفعت ہیں۔ ان کا باپ امرتسر سے ہجرت کر کے آیا اور اس مندر میں رہنے لگا تھا۔ اس کی بیوی مر گئی اور اس نے ان دونوں بچوں کو ماں کی طرح پالا تھا۔ میں تصویریں بنانے کا کام کرتا تھا۔ جیکب آباد سے میں لاہور آیا اور اتفاقاً میری ملاقات انکے باپ سے ہوئی بالکل اسی طرح جس طرح تم آج مجھے ملے ہو۔ میں یہاں رہ کر سینما کے پوسٹر بناتا رہتا لیکن میری بدقسمتی کہ میں نقرس کے مرض میں مبتلا ہو کر اپاہج ہو گیا اور ان

کا باپ ایک حادثہ میں مر گیا۔ یہ باہر جو ہاتھ سے کھینچنے والی ریڑھی کھڑی ہے۔ یہ ان کے باپ کی ہے۔ بیچارہ محنت مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالا کرتا تھا۔ اب یہ دونوں بچے میرا سہارا ہیں۔ آفتاب ایک ہوٹل میں پچاس روپے پر بہرہ گری کرتا ہے اور رفعت ایک صاحب کے ہاں ملازمہ کا کام کرتی ہے اور یوں ہمارا گزارہ چل رہا ہے۔ اب تم اپنے متعلق کچھ ہو۔

عظیم نے تھوڑی دیر سر جھکائے رکھا۔ پھر اس نے اپنی بدبختی کی داستان کہنی شروع کی۔ جب وہ اپنی کہانی سنا چکا تو اس نے دیکھا۔ بوڑھا شامو، رفعت اور آفتاب رو رہے تھے۔ شامو نے آنسو پونچھ کر بڑی ہمدردی سے کہا۔

تم ہم سے بھی زیادہ حالات کے ستائے ہوئے ہو۔ لیکن ہم سب مل کر اگر کوشش کریں تو ہم ایک خاندان کے افراد کی طرح اس بوسیدہ مندر کو ایک پُررونق اور آباد گھر کی شکل دے سکتے ہیں۔ تم اچھے بھلے پڑھے لکھے ہو کوشش کرو کہیں نہ کہیں سروس مل ہی جائے گی۔

عظیم نے اپنا جھکا ہوا سر اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

یہ باہر جو ریڑھی کھڑی ہے۔ کل سے میں اس پر کام شروع کرونگا۔ امید ہے میں خالی ہاتھ نہ آیا کرونگا۔ میں تینوں کا سہارا بن جاؤنگا۔ آج سے تم میرے باپ کی جگہ اور یہ دونوں میرے بھائی بہن ہیں۔

رفعت پہلی بار بولی۔ بھیا آپ کو ابھی بھوک ہو گی۔ میں آفتاب کو بھیجتی ہوں ہوٹل سے روٹیاں لے آتا ہے۔ سالن ہمارے پاس ہے۔ عظیم نے بڑی شفقت

سے کہا نہیں میری بہن میں اب پیٹ بھر چکا ہوں۔ رفعت نے آفتاب سے کہا۔
آؤ آفتاب دوسرے کمرے سے بھیا کے لیے چارپائی لے آئیں۔ دونوں بہن
بھائی مندر کے دوسرے کمرے سے جاکر عظیم کے لیے چارپائی اور بستر لے آئے
اسی کمرے میں انہوں نے عظیم کے لیے چارپائی لگا دی اور رفعت نے اس پر ایک
صاف ستھرا بستر بچھا دیا۔ چاروں اُٹھ کر اپنے بستروں پر آرام کرنے لگے۔ مندر سے
باہر تیز زمستانی ہوائیں بھوکے الو کی طرح چیختی چلاتیں واویلا کر رہی تھیں۔



دوسرے روز عظیم اندھیرے منہ اُٹھا۔ املتاس کے درخت کے بائیں جانب مندر
کی ایک دیوار کے ساتھ غسل خانہ تھا۔ وہاں اس نے غسل کیا۔ اتنی دیر تک رفعت اس
کے لیے ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ ناشتہ کر کے جب وہ مندر کے سامنے کھڑی لکڑی کی
اس وزنی ریڑھی کو کھینچ کر باہر لیجانے لگا تو رفعت نے بڑے پیار سے کہا۔
آج پہلا دن ہے۔ بسم اللہ پڑھ کر اور خدا کا نام لیکر جائیے۔ بھائی جان خدا آپ
کو آپ کے کام میں برکت دیگا۔
عظیم نے طنزاً کہا۔
خدا۔؟ ——— ہوں ——— کیسا خدا؟ ——— کون خدا؟ ———
یہ دنیا ——— یہ دنیا نور و ظلمات کی کشاکش اور ستیزہ کاری کے علاوہ کچھ
بھی نہیں۔ یہ کائنات چل رہی اور خود بخود اپنے محور کے گرد۔ گردش کرتی رہے گی۔

کوئی اس کا چلانے والا، کوئی نگہبان اور کوئی محافظ نہیں ہے۔

رفعت کا سر جھک گیا اور وہ اداس ہو گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس معصوم بچی کا دل عظیم کی باتوں سے ٹوٹ گیا ہو۔ اسی وقت بوڑھا شامو اپنی بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا عظیم کے پاس آیا اور بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

یوں نہ کہو بیٹے! یہ گناہ ہے۔ خدا ہے۔ ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت کے اندر خدا کو مانا جاتا ہے۔ کوئی اسے خدا اور رحیم کہتا ہے کوئی رام، بھگوان، پرمیشر اور ایشور جانتا ہے۔ کوئی اسے گاڈ اور کوئی یزدان کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ سب ایک ہی ہستی کے نام ہیں جو اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔

عظیم نے کوئی جواب نہ دیا اور ریڑھی کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ سیدھا اکبری منڈی آیا۔ وہاں پہلے بھی بہت سے ریڑھیوں والے کھڑے تھے۔ وہ بھی سڑک کنارے بجلی کے ایک کھمبے تلے کھڑا ہو گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد ایک بوڑھا اس کے پاس آیا اور بڑی ملائمت سے پوچھا۔

چلو گے بھائی؟

عظیم چوکنا ہو گیا۔

کہاں جائیں گے؟

قلعہ گوجر سنگھ۔

سامان کیا ہے۔

بس مختلف چیزوں کی پانچ بوریاں ہیں۔

کیا دیں گے؟

تم کیا لو گے؟

عظیم کو چونکہ اس کام کا تجربہ نہ تھا۔ لہٰذا اس نے بات اسی پر ڈال دی۔ آپ ہی بتا دیں کیا حرج ہے۔

دس روپے دے دوں گا۔

عظیم ریڑھی کھینچ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ چلتے چلتے اکبری منڈی کے اندر جا کر عظیم نے خود پانچ بوریاں اٹھا کر اپنی ریڑھی میں رکھیں اور اس بوڑھے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اونچے نیچے راستوں میں ریڑھی کھینچنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ وزن کافی تھا اور عظیم سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا تھا۔

قلعہ گوجر سنگھ میں سامان اتار کر وہ فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک لڑکے نے اسے روک کر پوچھا۔ خالی ہو؟

کمر سیدھی کر کے لمبا سانس لیتے ہوئے عظیم نے کہا۔

خالی ہوں۔

یہاں سے سیمنٹ کی صرف چار گٹھیاں ایجنسی سے لیکر فلیمنگ روڈ پر جانا ہے صرف ایک فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ بولو کیا لو گے۔

عظیم نے پہلی بار سودا طے کیا۔ پانچ روپے دے دیں۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔

آؤ پھر میرے ساتھ۔ عظیم اس کے ساتھ چل پڑا۔ سیمنٹ کی ایک ایجنسی سے اس نے سیمنٹ کی گٹھیاں لادیں اور فلیمنگ روڈ جا کر اتار دیں۔ یوں دوپہر تک اس

نے پندرہ روپے کما لئے تھے۔

فلیمنگ روڈ سے سرکلر روڈ کی طرف جاتے ہوتے وہ اپنے اسی مندر کے قریب سے گزرا جو اب اس کا ٹھکانہ اور رہائش تھی۔ ایک ہوٹل کے سامنے وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ہوٹل کے باہر وہی کتا کھڑا تھا جس کی دبائی ہوئی دو روٹیاں املتاس کے تنے کے قریب سے نکال کر اس نے کھائی تھیں اس کتے کے قریب ایک اور کتا بھی کھڑا تھا اس سے موٹا اور خوب توانا تھا۔ ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھانے والوں میں سے جب کوئی ان کی طرف ہڈی یا روٹی کا لقمہ پھینکتا تو دونوں کتے اسے حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھتے۔ لیکن کمزور کتا جب ہڈی یا روٹی کے ٹکڑوں سے قریب ہوتا تھا تو وہ توانا اور طاقت ور کتا غرا کر اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتا تھا اور یوں ہر بار وہ کمزور کتا اپنی دم اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں میں دبا کر بڑی ہی مایوسی کے عالم میں پیچھے ہٹ جاتا تھا۔

عظیم کے ذہن میں ایک خیال نے ٹھوکر لگائی۔ ان کتوں کی طرح بیسیوں صدی کے انسانوں کا بھی یہی عالم ہے ہر طاقت ور کمزور سے چھینا جھپٹی کر رہا ہے پھر ان کتوں اور بیسیویں صدی کے ان زنگ آلود انسانوں میں کیا فرق ؟

عظیم نے کچھ سوچا اور ہوٹل میں داخل ہوا۔ سبزی کی ایک پلیٹ اور چار روٹیاں لیکر وہ باہر آیا اور اپنی ریڑھی کے پہیے کے ساتھ ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اس کمزور کتے کو پچکار کر بلایا۔ وہ بھی شاید عظیم کو پہچان گیا تھا۔ اپنی دُم ہلاتا ہوا اور اپنے جسم کے پچھلے حصے کو خم دیتا ہوا عظیم کے قریب آیا۔ زمین

اپنی اگلے دونوں پاؤں پھیلا کر وہ بیٹھ گیا۔ اپنی دم زور زور سے وہ ہلانے اور نیچے زمین پر مارنے لگا۔ عظیم نے دو روٹیاں اس کتے کے آگے ڈال دیں اور دو خود کھانے لگا۔ اپنے دونوں پنجوں میں روٹیاں دبا کر کھاتے ہوتے وہ کتا بار بار کچھ ایسی آنکھوں سے عظیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جن میں تشکر ہی تشکر تھا۔

کھانا کھا کر عظیم اٹھا اور دوبارہ اپنی ریڑھی کھینچنے لگا۔ وہ ابھی چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ رک گیا اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا وہ کتا بھی اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا اس نے ریڑھی چھوڑ دی اور کتے کی طرف دیکھتے ہوتے کہا۔

میرے ساتھ کیوں آرہے ہو۔ بیوقوف! تمہارا اس ہوٹل میں ٹھکانہ تو ہے نا میں تو بالکل ہی بے آسرا انسان ہوں۔ میری ایک بھلائی کے بدلے میں تم کیوں میرے پیچھے آرہے ہو جاؤ واپس چلے جاؤ اور اسی ہوٹل میں اپنے پیٹ کا دوزخ بھرتے رہو۔

کتا دُم ہلا کر آگے بڑھا اور عظیم کے پاؤں چاٹنے لگا۔ کتے کے اس سلوک پر عظیم کے ذہن میں نہ جانے کیا سمائی وہ وہیں بیٹھ گیا اور کتے کے سر پہ ہاتھ پھیر کر پیار کرتے ہوتے کہا۔ شاید میری طرح تمہارا بھی کوئی خدا نہیں ہے۔ چلو پھر آجاؤ میرے ساتھ آج سے تم میرے بھائی ہو اور تمہارا نام قیصر ہے۔ عظیم دوبارہ ریڑھی کھینچنے لگا اور کتا جس کا نام اس نے قیصر رکھ دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

عظیم ابھی اپنے مندر کے قریب ہی تھا کہ ایک کار سڑک کے فٹ پاتھ کے ساتھ لگ اس کے قریب آکر رکی۔ وہ رک گیا اور ٹھٹک کر ادھر دیکھنے لگا۔ کار میں سے

کمل اتری تھی۔ وہ زرق برق لباس پہنے ہوئے تھی۔ عظیم اسے دیکھتا رہ گیا۔ کمل نے
اسے دیکھا پر دوسری طرف منہ پھیر کر آگے نکل گئی۔ عظیم نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ ا
یونما عمارت میں داخل ہوئی جس کے صحن میں مندر تھا۔ عظیم گیٹ کی اوٹ میں کھڑا
اسے دیکھنے لگا۔ کمل عمارت کی سیڑھیاں چڑھی اور دوسری منزل کے کمروں میں کہ
گھس گئی —

عظیم کا ٹوٹا ہوا دل اور چور چور ہو گیا تھا۔ ہر چیز سے اسے نفرت اور بیز
سی ہونے لگی تھی۔ زندگی میں اب رہ بھی کیا گیا تھا۔ وہ تو کمل کی تلاش میں گھر
نکلا تھا۔ پر اس نے بھی آنکھیں پھیر کر اجنبیت کا اظہار کر دیا تھا۔ بچارہ طوفان کے ہا
بجھ جانے والی شمع کی مانند ہو گیا تھا آہستہ آہستہ وہ اپنی رہڑی کے پاس آ
بددلی سے اسے کھینچنے لگا۔

شام تھکا ہارا وہ اس یونما عمارت میں داخل ہوا۔ رہڑی نے اس نے املی
تلے کھڑی کردی اور خود رہڑی کے پہیے سے ٹیک لگا کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا
کتا بھی اس کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ عظیم نے آنکھیں بند کر لی تھیں ا
ستانے لگا تھا۔ تھک گیا تھا بچارہ۔ زندگی میں کبھی ایسا کام جو نہ کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا اور بے حد حلاوت آمیز آ
میں اسے پکارا۔

بھیا! — عظیم نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ رفعت اسے پکار رہی تھی
کوئی جواب دینے والا تھا کہ رفعت پھر بولی۔

آپ یہاں کیوں بیٹھ گئے بھیا اندر چلئے نا۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ رفعت کی باتوں سے
عظیم کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی بہن عطیہ اسے پیار سے پکار رہی ہو۔ اس کی آنکھیں
نمناک ہو گئیں۔ جنھیں پونچھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

تھک گیا ہوں میری بہن!

رفعت نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔

آپ اندر تو چلئے نا۔ پھر میں آپ کی تھکاوٹ کا بندوبست کرتی ہوں۔ عظیم اس
کے ساتھ اٹھ کر مندر کی اس زندان نما مرطوب کوٹھڑی میں آیا۔ اندر شاموں دیوار سے
ٹیک لگائے کھانس کھانس کر حقہ پی رہا تھا۔ اس کے پاس آفتاب بیٹھا تھا۔ دونوں
کے درمیان دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی رکھی تھی۔ عظیم کو دیکھتے ہی شاموں نے کہا۔

تم آ گئے بیٹے! ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو! عظیم شاموں کے پاس بیٹھ گیا اور
گ کے اوپر ہاتھ پھیلا دیئے۔ شاموں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

کوئی مزدوری ملی ہے بیٹے!

عظیم نے جیب سے بیس روپے نکال کر شاموں کی طرف بڑھا دیئے۔ بائیس
روپے کمائے تھے بابا! جن میں سے دو روپے کی روٹی دوپہر کو کھائی تھی اور یہ بیس
روپے بچے ہیں۔

شاموں نے رفعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

گھر کا خرچہ تو رفعت ہی چلاتی ہے بیٹے! یہ اسے ہی دے دو۔ عظیم نے
نوٹ رفعت کی طرف بڑھا دیئے۔ رفعت نے روپے لیے اور پانچ روپے کا ایک

نوٹ واپس عظیم کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

یہ پانچ روپے اپنے پاس رکھیں بھیّا۔ یہ آپ کا روز کا خرچہ ہے۔ کام کرتے کرتے آپ تھک جاتے ہیں کچھ کھا پی لیا کریں۔ ایکدم عظیم کا رنگ لال سرخ ہو گیا اس کی حالت اس مجرم جیسی ہوگئی تھی جیسے جکڑ کر قتل گاہ میں کھڑا کر دیا گیا ہو۔ اسے ماں یاد آگئی تھی اس نے بھی تو ایک بار اس کی جیب میں بیس روپے ڈالتے ہوئے کہا ”سارا دن کام کرتے رہتے ہو کچھ کھا پی لیا کرو“ عظیم کی گردن جھک گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کی گود میں گرنے لگے۔

شاموں اور آفتاب پریشان ہو گئے۔ رفعت آگے بڑھی اور عظیم کے گھٹنے پر سے ٹھوڑی رکھتے ہوئے اسے پکارا۔

بھیّا!

عظیم خاموش رہا اور اس کے آنسو بہتے رہے۔

رفعت نے اس بار بڑے دکھ اور کرب سے کہا۔ بھیّا! میں آپ کی بہن بلا رہی ہوں۔ عظیم نے آستین سے آنکھیں پونچھیں اور سر گھما کر رفعت کی طرف د

رفعت نے روتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

آپ روتے کیوں ہیں بھیّا۔

لرزاں اور پھٹی آواز میں عظیم نے کہا۔

مجھے میری ماں یاد آگئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح میری جیب میں روپے ڈا کہا کرتی تھی۔ کچھ کھا پی لیا کرو۔ جس طرح آج تم نے کہا ہے۔

رفعت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کیا میں آپ کی بہن نہیں ہوں؟

عظیم نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ تم میری بہن ہو۔

رفعت عظیم کی چھاتی سے لپٹ گئی۔ بھیّا!۔ عظیم نے اسے لپٹا لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے رفعت کے سر پر گر رہے تھے۔ رفعت بیچاری رو رو کر عظیم کا دامن بھگو رہی تھی۔ شاموں اور آفتاب نے منہ دوسری طرف کر لیے تھے اور ہلکی ہلکی ہچکیوں میں وہ بھی رو پڑے تھے۔ پرانے اور قدیم مندر کی اس کوٹھڑی کی فضا مغموم ہو گئی تھی۔

رفعت نے علیحدہ ہو کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

میں آپ کے لیے پانی گرم کرتی ہوں بھیّا! آپ نہا لیں ساری تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔ رفعت جب باہر نکلنے لگی تو عظیم نے اسے پکارا۔

سنو منی! رفعت رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

عظیم نے پھر پوچھا۔ تم دونوں کچھ پڑھے لکھے بھی ہو۔

میں نے تو آٹھویں پاس کر کے چھوڑ دیا تھا بھیّا! اور آفتاب آٹھویں سے اٹھ گیا تھا۔

تم دونوں بہن بھائی پھر سکول میں داخلہ لو۔ میں تم دونوں کو پڑھاؤنگا۔ اور تمہارے سارے اخراجات پورے کرونگا۔ تم کسی کے ہاں ملازمہ کا کام نہ کرو گی۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔ اور ایک بھائی کے لیے یہ بات شرم کی ہے کہ اس کی بہن

لوگوں کے ہاں کام کرتی پھرے۔ پھر اس نے شاموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
بابا! تم دونوں بہن بھائی کو کل پھر سکول میں داخل کرانے کا بندوبست کرو۔
تم تینوں کے اخراجات پورے کروں گا۔ شامو کے چہرے پر اطمینان کے رنگ
گئے تھے اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

خدا تمہیں اس نیک کام کا صلہ دے گا۔ رفعت مسکراتی ہوئی باہر نکل
علیم نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

کوئی خدا نہیں ہے بابا! ہر کوئی اپنے مقدر کا نگہبان ہے۔ ہر انسان کی خ
لامحدود اور لاانتہا ہے اور ایک لاانتہا سے وہ دوسرے لاانتہا کو مسخر کرتا۔
ہر انسان ایک موسیقار ہے اور اپنی زندگی کی ساری دھنیں وہ خود مرتب کرتا۔
ہر شخص پھنیدے اور اندرائن کے اس پودے کی طرح ہے جو ریتلی زمینوں
خود بخود اگتا، پھیلتا اور پھر خشک ہو جاتا ہے۔

شاموں نے اس کی نفی کی۔

یہ درست نہیں ہے بیٹے! یہ ساری کائنات ایک غزل ہے اور اس
اشجار اس غزل کے شعر ہیں۔ یہ گہرا، نیلا اور شفاف آسمان ایک خیابان ہے ا
ستارے اس خیابان کے پھول ہیں اور پھر تم جانو کوئی غزل اور اس کے اشعا
شاعر کے بغیر وجود میں نہیں آسکتے۔ کوئی خیابان اور اس کے پھول باغبان
بغیر پھل پھول نہیں سکتے۔ پھر تم ہی غور کرو میرے بیٹے! یہ زمین، آسمان۔ یہ
اور غراتے ہوتے سمندر اور پھر زمین اور سمندر کی تہ سے نکلنے والی قیمتی دھا

اور مائع کیسے بغیر کسی صناع کے اپنے وجود میں آگئے۔

شاموں کی باتوں کا علیم کوئی جواب نہ دے سکا۔ اتنے میں رفعت اندر آئی
اور علیم کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

چھوڑئیے اس بحث کو بھیا۔ میں پانی گرم کر آئی ہوں۔ اُٹھ کر نہا لیجئے پھر سب
مل کر کھانا کھائیں۔ علیم اُٹھا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔





صبح سویرے ہی آدھا ناشتہ اس نے خود کیا اور آدھا اپنے کتے کو کھلانے
بعد جب وہ اس یونما عمارت کے احاطہ سے نکلا تو اس کی نگاہیں سکول جاتی ہوئی
بچی پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے اپنا ریڑھ ایک طرف کھڑا کیا اور اس بچی کی طرف بڑھ
وہ سیبل تھی۔ کمل کی چھوٹی بہن۔ اس کے قریب جا کر عظیم نے اسے پکارا۔

سیبل سیبل!

سیبل نے مڑ کر دیکھا۔ پھر بھاگی اور عظیم سے لپٹ گئی۔ بھیا! عظیم نے اسے
پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

تم لوگ کہاں رہتے ہو بے بی!

سیبل نے اسی یونما دو منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہم نے
اس عمارت میں دو کمرے کرائے پر لے رکھے ہیں۔

ابو کہاں ہیں؟

گھر ہیں۔

اور باجی؟

وہ بھی گھر ہیں۔ شام کو جاتی ہیں۔

کہاں؟

ٹیوشن پڑھاتی ہیں نا۔ ابو زیادہ بیمار ہو گئے ہیں۔ ان کی سروس بھی جاتی رہی
ہے۔ اب باجی ہی مجھے پڑھا رہی ہے۔ ابو کا علاج بھی کرا رہی ہے اور گھر کے
اخراجات بھی میری باجی ہی چلاتی ہے۔ چلو بھیا میں آپ کو گھر لیکر چلوں۔ ابو آپ کو
بہت یاد کرتے ہیں۔ عظیم اس کے ساتھ ہو لیا۔ چلو۔

عظیم جب اپنی ریڑھی کھینچنے لگا تو سیبل نے پریشانی سے پوچھا۔

یہ آپ کی ہے بھیا!

اس کی طرف دیکھے بغیر عظیم نے کہا۔ ہاں بے بی۔

آپ کیا کام کرتے ہیں بھیا۔

مزدوری کرتا ہوں بے بی۔

سیبل اداس اور خاموش ہو گئی۔ دونوں عمارت کے احاطے میں داخل
ہوئے۔ عظیم نے وہاں ریڑھی کھڑی کی اور سیبل کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں سیڑھیاں
چڑھ کر اوپر گئے اور ایک کمرے میں داخل ہوتے۔ سامنے ہی معمولی سی ایک کھاٹ
پر فرانسس پڑے تھے۔ ان کے پاس کمل بیٹھی تھی۔ عظیم کو دیکھتے ہی فرانسس کے

نیلے نیلے بے جان ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ انہوں نے اٹھنا چاہا پر عظیم نے
آگے بڑھ کر ان کی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ لیٹے رہیے آپ کی صحت کیسی ہے
فرانسس خاموش رہا۔ وہ جواب نہ دے پا رہا تھا۔ عظیم نے دیکھا اس کی بجھی
بجھی سی آنکھوں سے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک کر بستر پر گرنے لگے تھے پھر بڑے
کرب کا اظہار کرتے ہوئے وہ بولے۔

مجھے تمہاری امی اور بہنوں کے مرنے کا بے حد دکھ اور صدمہ ہے۔

عظیم کا سر جھک گیا۔ وہ ضبط نہ کر سکا۔ پلکوں کی منڈھیر پر چند قطرے نمودار ہوئے
پھر اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر پانی بہہ نکلا اور وہ بچوں کی مانند ہچکیاں لے کر رونے
لگا۔ فرانسس کمل اور سیبل بھی رو رہے تھے۔

فرانسس سنبھلا اور نحیف آواز میں پوچھا۔

کمل نے مجھے تمہارے پورے حالات بتائے تھے کہ قیصر سے تمہارا جھگڑا ہوا
تھا اور تم پاگل ہو گئے تھے۔ پھر تم گھر سے ہی کہیں چلے گئے۔ کمل تمہارے ہاں جا
رہی ہے۔

عظیم کا ضمیر اندر ہی اندر چلا اٹھا۔

میں تھوڑا ہی گھر سے چلا گیا تھا۔ کمل نے ہی ملنا ترک کر دیا تھا۔ میں تو آج تک
اس کی تلاش اور جستجو میں سوکھے پتے کی طرح بھٹکتا رہا ہوں۔

فرانسس پھر بولا۔

کہاں چلے گئے تھے۔

عظیم نے سر جھکائے رکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

فرانسس نے پھر اسے چونکایا۔ بولتے کیوں نہیں۔ کہاں رہتے ہو آجکل؟

اسی عمارت کے احاطے میں جو مندر ہے اس میں رہتا ہوں۔ وہاں تین دکھی
اور حالات کے ستائے ہوئے افراد رہتے ہیں۔ ان سے راہ رسم ہو گئی تھی اور اب میں
ان کے پاس ہی رہتا ہوں۔

کیا کام کرتے ہو:

ٹھیلا کھینچتا ہوں اور مزدوری کرتا ہوں۔

فرانسس کی آواز ڈوب کر رہ گئی۔ کب تک ایسے کام کرتے رہو گے۔

عظیم کا سر پھر جھک گیا۔ جب تک سانس میں سانس ہے۔

قیصر اور عاصفہ کہاں ہیں؟

اپنے گھر رہتے ہیں۔

فرانسس خاموش ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے وہ کن سوچوں میں الجھ
گیا تھا۔ عظیم نے پہلی بار پرشکوہ اور جواب طلب نگاہوں سے کمل کی طرف دیکھا۔ کمل
کے چہرے پر وہی پرانی اجنتا کی سندرتا اور الحمرا کی سی خوبصورتی تھی۔ وہی گہری گھنی
پلکوں والی شفاف اور موٹی سیاہ آنکھیں اور اس کے جسم سے وہی جنگلی پھولوں کی
سی پرانی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہی اطالوی وائلن کی طرح نازک اور چھریرا بدن
تھا۔ تاہم اس کا چہرہ اداس تھا۔ پچھلے پہر کے زرد چاند کی طرح۔ وہ یوں بیٹھی تھی گویا
اس میں روح نہ ہو اور ــــــ اور وہ کنواری مریم کا حسین مجسمہ ہو۔ محسوس

ہوتا تھا۔ گویا اس سے کسی نے اس کی زندگی کا رسیلا پن چھین لیا ہو۔ کمل نے
سر گھما کر عظیم کی طرف دیکھا۔ عظیم کو لگا جیسے کمل کی نگاہیں منجمد ہوں اور اس کی آنکھ
جن میں کبھی بجلی کے قمقموں کی ہنسی اڑانے والی چمک ہوا کرتی تھی۔ آج وہی چمک
اداس اور سرد لگ رہی تھی۔

فرانسس کی آواز پھر ابھری جیسے وہ طویل غنودگی کے بعد بیدار ہو رہے
ہوں انہوں نے کمل سے کہا۔

کمل! چائے ہی بنا لاؤ بیٹی!

کمل نے اپنا آپ سمیٹا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ فرانسس اور عظیم وہیں ب
کر باتیں کرنے لگے۔ سیبل عظیم سے اجازت لیکر سکول چلی گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کمل پھر اس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ
چائے کا کپ اور دوسرے میں بسکٹ کی پلیٹ تھی۔ اس نے عظیم کو چا
تھمائی۔ اس کے نازک ہاتھ کانپ رہے تھے پھر اس نے بسکٹ کی پلیٹ ع
کے سامنے تپائی پر رکھ دی اور باہر نکل گئی۔

عظیم نے خاموشی سے چائے پی اور کھڑا ہوتا ہوا فرانسس سے مخاطب ہ
مجھے اب اجازت دیجئے۔ میرا ٹھیلا نیچے کھڑا ہے۔ میں اب آتا رہوں گا۔ فرا
نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

جاؤ۔ پر پہلے کی طرح پھر کہیں کھو نہ جانا۔ بیٹے! میں موت کے منہ
میں ہوں۔ میرے بعد خدا کے علاوہ کمل اور سیبل کے تم ہی آسرا ہو۔

عظیم پھر اداس ہو گیا۔ تاہم وہ کمرے سے نکلا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کمل اسے
کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں کمل بیٹھی برتن
دھو رہی تھی۔ عظیم اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ کمل نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا
عظیم نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

کمل! اس روز تم کس کی کار سے اتری تھی۔

کمل نے نگاہیں بھر کر عظیم کی طرف دیکھا۔ پھر بے تعلقی سے کہہ دیا۔

آپ کو اس سے کیا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ مجھ سے جواب طلبی نہیں
کر سکتے۔ عظیم تھوڑی دیر تک اسے رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر لڑکھڑاتا
ہوا وہ باہر نکل گیا۔ کمل کے رویے نے اس کے ذہن پر شدید ضرب لگائی تھی۔
اس کا رنگ سرسوں کی پیلاہٹ ہو گیا تھا۔ تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوتے وہ
بڑی مشکل سے گرتے گرتے بچا تھا نیچے آ کر اس نے اپنا ٹھیلا پکڑا اور اسے
کھینچنے لگا۔ اس کا کتا اس کے ساتھ تھا۔

کمل اپنے کمرے سے بھاگتی ہوئی نکلی تھی اور آخری سیڑھی کے قریب دیوار
کی اوٹ میں ہو کر عظیم کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ رو رہی
تھی۔ عظیم جب ریڑا کھینچتا ہوا باہر نکل گیا تو دیوار پر زور زور سے سر مارتے ہوتے
کمل نے تکلیف دہ احساس کے ساتھ کہا۔

میرے عظیم! اگر تم آسیہ میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور پہلے کی طرح مجھ سے محبت
کرتے ہو پھر بھی میں اب تمہارے قابل نہیں رہی۔ میں لٹ چکی ہوں میرے عظیم! بیسوں

صدی کی تہذیب کے کھردرے ہاتھوں نے مجھے برباد کردیا ہے۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھی میں ــــ میں بک چکی ہوں میرے عظیم! میں بِک چکی ہوں۔

عظیم اپنی دھن میں ٹھیلہ کھینچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا ذہن منتشر تھا۔ کمل کے رویے پر اندر ہی اندر اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس کا ذہن زور سے چلایا۔

میرے ساتھ ہر کسی نے دھوکہ ہی کیا ہے۔

ذہن کا کوئی تاریک اور قساوت پسند پہلو بیدار ہو کر بولا۔ کہیں ڈوب مرو خودکشی کرلو ہر دکھ سے چھٹکارا مل جائے گا ــ عظیم نے سر کو زور سے جھٹک دیا

ہرگز نہیں۔ میں محنت کرونگا۔

آنتھک محنت جو کبھی بے ثمر نہیں رہتی۔ میں اپنے آپ کو تنہا زندہ رہنے کا عادی بنالونگا۔ سکول کی ایک عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ رک گیا اندر بچّے ترنم کے ساتھ دُعا پڑھ رہے تھے۔

تیرا رتبہ سب سے عالی اے خالقِ کون ومکاں

تو ارض وسما کا والی اے خالقِ کون ومکاں

ظاہر میں عیاں باطن میں نہاں

اے شاہ جہاں تو یہاں نہ وہاں

ہم تیرا نشاں ڈھونڈیں تو کہاں

ہے تیری شان نرالی اے خالقِ کون ومکاں

گلشن میں تیرا جلوہ دیکھا

پھولوں کی ادا بلبل کی صدا

دیتی ہے پتہ یہ بادِ صبا

تو باغِ جہاں کا مالی اے خالقِ کون ومکاں

ہر فردِ بشر تیرا دستنگر

تیرا در ہے وہ در جہاں جھکتے ہیں سر

عظیم کی ذہنی کیفیت اور بگڑ گئی۔ اور اپنا ٹھیلہ کھینچتے ہوئے وہ زور زور سے چلانے لگا۔

یہ جھوٹ ہے۔ کوئی کسی کا سوالی اور دستنگر نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے کردار کا مالک اور خالق ہے۔ کوئی خدا نہیں ہے۔ دنیا والو میں تم سے پوچھتا ہوں بتاؤ "خدا کہاں ہے"

دوپہر تک اس نے مزدوری کی پھر لوٹ آیا۔ آج اس کا جی نہ لگا تھا۔ کمل کے رویے نے اس کی جبلگی، کلیت، عمومیت اور اس کے تمام دکل کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ تھک گیا تھا لہٰذا گھر لوٹ آیا۔ جب اس نے ٹھیلہ املتاس کے درخت تلے کھڑا کیا تو اس نے دیکھا کمل کہیں جانے کے لیے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اتنے میں شاموں بیساکھیوں پر لڑکھڑاتا ہوا مندر سے نکلا اور پریشانی میں پوچھا۔

آج سویرے آگئے ہو بیٹے!

عظیم فوراً ٹال گیا۔ ایک جگہ کام جانا ہے بابا!

شاموں نے خوشی کے اظہار میں کہا۔ میں آفتاب کو سکول داخل کرا آیا ہوں۔

تم نے بہت اچھا کیا بابا!

رفعت بھی بھاگتی ہوئی باہر آئی اور پیار سے کہا۔

آئیے بھائی جان پہلے کھانا کھائیے۔

عظیم نے دیکھا کمل باہر نکل گئی تھی۔ لہٰذا اس نے رفعت کو بھی ٹال دیا۔

میں ایک جگہ کام سے جا رہا ہوں منی! تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔ وہ عمار
کے احاطے سے نکلا اور بڑی رازداری سے کمل کا تعاقب کرنے لگا۔

بڑی سڑک پر آکر کمل نے رکشا کر لیا۔ عظیم بھی رکشے میں اسکا تعاقب کرتے
ایک پُر رونق اور بڑی شاہراہ پر کمل رکشے سے اُتر گئی۔ عظیم نے بھی رکشے کو
کر دیا۔ وہاں سے ایک ذیلی سڑک پر کمل تھوڑی دُور تک آگے گئی۔ پھر ایک کئی
عمارت میں داخل ہو گئی۔ عظیم عمارت کے باہر کھڑا ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کر

اسی حالت میں کافی دیر ہو گئی۔ پھر عظیم نے دیکھا ایک کار اس عمارت کے
آکر رُکی تھی اور اس سے ایک خوبصورت جوان اُتر کر اس عمارت میں داخل ہ
عظیم پھر انتظار کرنے لگا۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ پھر اسے کسی کے سیڑھیاں اُتر
کی آواز سنائی دی۔ عظیم سیڑھیوں کے قریب ہی ایک ستون کی اوٹ میں ہو گ

کمل اور اس کے ساتھ وہ جوان بھی جو کار میں آیا تھا۔ سیڑھیوں سے باہر
تھے۔ کار کے نزدیک آکر اس نوجوان نے کمل سے پوچھا۔

اب کہاں جاؤ گی۔

اپنے گھر۔

نہیں میرے ساتھ چلو تھوڑی تفریح ہو جائے گی۔

کمل نے بے تعلق سے لہجے میں کہا۔ تم اپنا مطلب نکال چکے ہو۔ اب مجھ سے کیا
چاہتے ہو۔ اس جوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

تم چیز ہی ایسی ہو جسے بھولا نہیں جا سکتا۔ چلو دونوں اکٹھے فلم دیکھتے ہیں پھر
تمہیں چھوڑ آؤں گا۔

کمل نے آگے بڑھنا چاہا۔ نہیں مجھے گھر جانا ہے۔ اس جوان نے کمل کا ہاتھ
پکڑ کر زبردستی کار میں بٹھا لیا۔ یوں ہی ضد نہیں کرتے۔ پھر وہ خود بھی سٹیرنگ پر
بیٹھ گیا اور کار آگے رینگ گئی۔

عظیم بچارہ اُلجھ گیا تھا۔ ستون کی اوٹ سے وہ نکلا اور عمارت کی سیڑھیاں چڑھ
کر اس عمارت میں داخل ہوا۔ ایک کمرے کے سامنے جس کے چہرے پر لکڑی
کا ایک بورڈ پر موٹے حروف میں لکھا تھا ”OFFICE“ وہ رک گیا۔ اندر ایک
خاتون جو اُدھیڑ عمر کی تھی، جس کے بال تراشیدہ اور جو شکل و صورت سے اینگلو
انڈین لگتی تھی اس سجے ہوئے آفس میں بیٹھی سگریٹ پھونک رہی تھی۔ عظیم جب
اندر داخل ہوا تو اس عورت نے پوچھا۔

کیا بات ہے۔

عظیم اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر بات
کرنا چاہتا ہوں۔

اس نے ایک لمبا کش لیکر کہا —— کہو۔

یہ لڑکی جو ابھی ابھی ایک نوجوان کے ساتھ اس عمارت سے نکلی ہے ا
جس کا نام کمل ہے۔ میں اس کے متعلق جاننا چاہتا ہوں کہ وہ ایسا دھندا کب سے ک
ہے۔ اس عورت نے خفگی میں کہا۔

تمہیں اس سے کیا۔

آپ ناراض نہ ہوں۔ مجھ سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ میرے ایک
کی لڑکی ہے۔ بس میں اپنے ذہنی انتشار کو ختم کرنے کے لیے یہ جاننا چاہتا
کہ وہ کیسے اور کیوں ان حالات کا شکار ہوتی ہے۔

عورت ہچکچاتی ــ میں ـــــــ علیم نے منت و التجا کی مجھے ا
نہ سمجھیے ــ

اس عورت نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

سنو! میرا نام ڈورتھی ہے۔ میں اس کے متعلق اتنا ہی جانتی ہوں ک
کا باپ ایک عرصے سے بیمار ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ گھر کے اخ
پورے کرنے کے لیے وہ ایک جگہ ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ جس صاحب کے ہا
پڑھاتی تھی۔ اس نے ایک روز جبکہ اس کی بیوی بچے کہیں دعوت میں گئے
تھے اس نے زبردستی کمل کی عزت لوٹ لی۔ اس حادثے سے کمل کا د
گیا اور اسے مردوں سے نفرت سی ہوگئی پھر اسی محلے کا ایک بوڑھا جو میرا
ہے۔ اس نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ لڑکی چونکہ ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت
لہٰذا اس بوڑھے نے بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے اسے اپنی

اور کہیں سروس دلانے کا وعدہ کرکے وہ اس لڑکی کے قریب ہوگیا اور لڑکی
اکثر اس خیال سے اس کے پاس آنے لگی کہ اسے کہیں سروس مل جائے گی اور
دوبارہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی۔

ایک روز اس بوڑھے نے بھی ایک صاحب سے پانچ ہزار روپیہ لیکر کمل
کو اپنے مکان کے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ پھر اس صاحب کو بلایا اور اس نے
بھی زبردستی کمل کی عزت لوٹ لی۔

یوں دو بار مردوں کے ہاتھوں لٹنے کے بعد کمل کو مردوں سے انتہا کی نفرت
ہوگئی۔ پھر وہ میری ایک ایجنٹ عورت کے ذریعے میرے ہاتھ چڑھ گئی۔
یں نے اسے اپنے حق میں اونچ نیچ سمجھائی اور اسے ترغیب دی کہ وہ عزت
یچ کر مردوں سے بھاری رقمیں وصول کرے اور یوں ان مردوں سے انتقام
ے جنہوں نے اسے برباد کیا۔ اب وہ مردوں سے انتقام لینے کی خاطر عزت
یچتی ہے اور بھاری رقمیں وصول کرتی ہے۔

اں اس میں ایک صفت ہے۔ ایک بار عزت بیچنے کے بعد جب تک
ر کے اخراجات چلانے کی خاطر اس کے پاس رقم رہے وہ عزت نہیں بیچتی۔
ب خالی ہاتھ ہوتی ہے۔ میرے پاس چلی آتی ہے۔ بیشمار نوجوان اس پر مرتے
ں۔ میں ان میں سے کسی کو فون پر اطلاع کرتی ہے وہ آتا ہے اور یہیں اس عمارت
ں بھاری رقم کے عوض کمل کی عزت لوٹ کر چلا جاتا ہے۔

تم اس سے کیا وصول کرتی ہو؟

ٹین پرسنٹ۔

تم اور کیا کام کرتی ہیں۔

کمل کی طرح میرے ہاتھ میں اور بہت سی لڑکیاں بھی ہیں۔ میں انہیں ماڈ
گرل، فلم ایکٹرا گرل، ڈانسر اور طوائف کے رُوپ میں پیش کر کے کمیشن وصو
کرتی ہوں۔ یہ عمارت اصل میں رقص کی تربیت گاہ ہے اور کئی لڑکیاں یہاں ڈا
سیکھنے آتی ہیں۔ ان میں سے بھی اکثر میرے کام آ جاتی ہیں اور یوں میرا دھ
چلتا رہتا ہے۔

تم ایک وعدہ کرو گی۔

کہو ۔

میری اس ملاقات کا ذکر کمل سے نہ کرنا۔

مجھے کیا ضرورت ہے۔

عظیم کھڑا ہو گیا۔ میں تمہارا مشکور رہوں۔

ڈورتھی نے تنبیہہ کی۔ سنو اگر تم نے اس عمارت کا راز کسی سے کہا۔ تو پھر
لینا تم زندہ نہ رہو گے۔ میرا کوئی نہ کوئی ایجنٹ تمہیں ٹھکانے لگا دے گا۔

مجھے کیا ضرورت پڑی ہے آپ لوگوں سے اُلجھتا رہوں۔

عظیم سیڑھیاں اترا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اِس کے جسم کے سارے
بکھر گئے تھے۔ اس کی حالت اس کمزور چٹان جیسی ہو گئی تھی جسے سمندری لہر
وحشیانہ کشمکش کے بعد بھربھرا کر دیا ہو۔ کمل سے محبت کی آگ نے اسے ایک

روگ میں مبتلا کر دیا تھا۔ کمل سے اسکی زخم خوردہ محبت نے اس کے تشخص تک کو
طوفان کی طرح تار تار اور جھبیر جھبیر کر کے چھدرا کر رکھ دیا تھا۔

عظیم واپس مندر آیا۔ نہا کر اس نے کھانا کھایا۔ اور چہل قدمی کا بہانہ
کر کے وہ مندر کے ارد گرد گھوم کر کمل کا انتظار کرنے لگا۔ اندھیرا جب پھیل
گیا اور عمارت کی روشنیاں جل اُٹھیں۔ کمل عمارت میں داخل ہوئی۔ عظیم
تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ کمل جب سیڑھیاں چڑھنے لگی تو عظیم اس کا راستہ
روک کر کھڑا ہو گیا اور ہکلاتے ہوئے پُوچھا۔

جو راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے اس میں رسوائی ہی رسوائی ہے
اب بھی کچھ نہیں بگڑا سنبھل جاؤ۔ اگر یہ راز فاش ہو گیا تو تمہارے اُوپر کیا
گزریگی۔ لوگ تم پر انگلیاں اُٹھا اٹھا کر کہیں گے کہ ——— کمل
نے عظیم کی بات کاٹ دی اور بے رُخی سے کہا۔

مجھے کسی ناصح اور رہبر کی ضرورت نہیں اور پہلو بچا کر سیڑھیاں چڑھ
گئی۔ عظیم کا سر جھک گیا اور دل برداشتہ سا ہو کر مندر آ گیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ ایک بارونق بازار کے کونے میں اپنے ٹھیلے کے پہیے سے ٹیک لگا کر آرام کر رہا تھا۔ اس کا کتا جسے وہ اب تیغ کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ اس کے پاؤں پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ کسی نے اسے قریب ہی سے پکارا۔

"اے ٹھیلے والے!

عظیم کھڑا ہو گیا اور اپنی پھٹی ہوئی قمیض درست کرنے لگا۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر اور ملازم قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ عظیم نے اس سے پوچھا۔

کیا بات ہے؟

چلو گے؟ وہ سامنے والی دکان سے دو صوفہ سیٹ لیجانے ہیں

کیوں نہ چلونگا۔ اپنا تو دھندہ ہی یہ ہے۔ چلو۔ ٹھیلا جب وہ کھینچنے لگا تو کتا بھی اُٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ بوڑھے کی مدد سے اس نے دونوں صوفہ سیٹ دکان سے نکال کر اپنے ریڑھے پر لاد کر رسی پھیر دی اور بوڑھے سے کہا۔

بیٹھو ٹھیلے پر اور چلیں۔

بوڑھے نے ہمدردی سے کہا۔ نہیں نہیں۔ اس طرح بوجھ زیادہ ہو جائیگا۔ میں پیدل ہی چلونگا۔ نہیں بڑے میاں تم بیٹھو ٹھیلے پر۔ غریب کو کھینچتے ہوئے میں فخر محسوس کرونگا۔ تمہارے بیٹھنے سے میری ساری تھکاوٹ جاتی رہے گی۔ میں سمجھونگا۔ میں نے کوئی نیک کام کیا ہے۔ جس کے صلے کی میں کسی سے اُمید نہ رکھونگا۔ اگر تم میرے ساتھ پیدل چلے مجھ پر میرے ضمیر کا بوجھ اور زیادہ ہو جائیگا۔

بوڑھا مان گیا۔ اور عظیم نے اُسے سہارا دیکر ریڑھے کے اُوپر بیٹھا دیا۔ عظیم نے ریڑھ کھینچنا شروع کر دیا اور بوڑھا اسے راستہ بتاتا جا رہا تھا۔ بوڑھا اسے ان راستوں پر لیجا رہا تھا جو اس کے اپنے گھر کی طرف جاتے تھے۔

گھر؟

جو اس کے لیے اب گھر نہیں۔ جہنم کی کوئی تاریک غار تھی جو اس کی ماں اور بہنوں کو نگل گئی تھی۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ اور اونچی نیچی سڑکوں

پہ ٹھیلا کھینچنا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اسی رفتار سے چلتا رہا اور ریڑھے کے جھول کھاتے ہوتے پہیئے کھڑ کھٹ کی آوازیں پیدا کرتے رہے۔ عظیم کے اپنے گھر کے عین سامنے آکر اس بوڑھے نے عظیم کو رک جانے کے لیے کہا۔ عظیم رک گیا۔ کمر سیدھی کی اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس بوڑھے سے پوچھا۔

کس مکان میں لیکر جاؤ گے۔

بوڑھے نے عظیم کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں

تم کب سے یہاں رہتے ہو۔

میں ان کا ملازم ہوں۔ پچھلے چند ماہ سے یہاں ہوں۔ ٹھہرو میں گیٹ کھولتا ہوں۔ پھر ریڑھ اندر لے چلو۔ تم نے میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا ہے تو ایک اور مہربانی بھی کرتے جانا۔

کیا؟

یہ ساری چیزیں اٹھا کر اندر بھی رکھتے جانا۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ اگر اٹھا نہ سکوں گا۔ میں کوشش کرونگا۔ تمہیں مزدوری زیادہ دلا دوں۔ اگر دلا سکا تو مجھے معاف کر دینا۔ تم میرے بیٹے کی جگہ ہو۔

بوڑھے کی باتوں پہ عظیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھٹی ہوئی آستین سے اس نے آنکھیں خشک کرتے ہوتے کہا۔

بڑے میاں! تم ملازم ہو اور میں مزدور ہوں۔ اگر تم مجھے کچھ

دو گے تو بھی میں مسکراتا ہوا چلا جاؤنگا۔ یہ سارا سامان تم جہاں کہو گے میں اکیلا اُٹھا کر رکھ دونگا۔ تم گیٹ کھولو۔

بوڑھے نے گیٹ کھولا اور عظیم اپنے گھر داخل ہوا۔ بوڑھے نے اسے یوکلپٹس تلے رک جانے کو کہا اور خود اندر جاتے ہوتے کہا۔

میں آتا ہوں بیگم صاحبہ سے پوچھ آؤں یہ کس کمرے میں رکھوانے ہیں۔ بوڑھا اندر چلا گیا۔ عظیم اپنے مکان کا جائزہ لینے لگا۔ ماں اور بہنوں کے نہ ہونے سے مکان کیسا سرسام زدہ، اذیت دہ اور دوزخ نما لگ رہا تھا۔ اس کے اُوپر یوکلپٹس کا درخت اداس کھڑا تھا۔ وہی درخت جس تلے بیٹھ کر وہ پڑھا کرتا تھا۔ سامنے اس کا کمرہ تھا جس پر اب نئے اور پھولدار موٹے موٹے پردے لٹک رہے تھے۔ عظیم کے دل کے قصر سے ایک ہوک سی اُٹھی اور اُس کی آنکھیں پھر نمناک ہونے لگیں۔

عظیم فوراً سنبھل گیا۔ اس کے سامنے اس بوڑھے کے ساتھ قیصر اور عاصفہ نکلے تھے۔ عظیم کو دیکھتے ہی عاصفہ کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ اس پر سیمابی کیفیت طاری ہو گئی۔ آہستہ آہستہ وہ آگے بڑھی بالکل یوں جیسے وہ سحر زدہ ہو گئی ہو۔ اور اسی شہودی حالت میں قیصر کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر اس نے عظیم سے پوچھا۔

آپ یہاں اور اس حالت میں ؟

عظیم نے کوئی جواب نہ دیا اس کے چہرے پر ابھی تک بریدہ رنگ اور

غموں کی گرد تھی۔ عاصفہ نے آگے بڑھ کر عظیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

آپ اندر آئیے۔ یہ گھر آپ کا ہے۔ آپ یہ کام کیوں کرتے ہیں۔

عظیم چونکا اور یوں سنبھلا جیسے ایک لمبی مسافت بھاگ کر تیرگی کے ہجوم سے نکلا ہو۔ عاصفہ کا ہاتھ جھٹکتے ہوتے اس نے ترشی سے کہا۔

کون ہو تم؟

عاصفہ نے بڑے رحم انگیز لہجے میں کہا۔

میں عاصفہ ہوں۔ مجھے پہچانیے جس کے ساتھ آپ اسی گھر میں رہا کر تھے۔ اور جس کے آپ کبھی منگیتر تھے۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ قیصر سے شاد کر کے میں نے غلطی کی ہے میری منزل آپ تھے۔ میں بھٹک گئی تھی۔ مجھ معاف کر دیں۔ عاصفہ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

قیصر اور بوڑھا ملازم عاصفہ کی گفتگو سن کر پریشان ہو رہے تھے۔ عا بیچاری کا بھی کیا قصور تھا۔ ریحانہ کی وجہ سے وہ عظیم سے دور ہوتی تھ عظیم اس کی ہر بات مانتا تھا۔ اب جبکہ ریحانہ نہ تھی۔ یہ ایک جبلی، فطر خلقی فعل اور قدرتی، طبعی داصلی عمل تھا کہ وہ دوبارہ عظیم کی طرف جھک رہی تھی۔

عاصفہ کو نظر انداز کر کے عظیم نے بوڑھے سے کہا۔

بڑے میاں! بتاؤ یہ سامان کہاں رکھوں۔ بوڑھا عظیم کی طرف بڑ پہلے سارا سامان نیچے اتارو پھر بتاتا ہوں کہاں رکھنا ہے عظیم اپنے ٹھیلے

کی طرف بڑھا اور سامان کو بھیری ہوئی رسی کھولنے لگا۔

قیصر نے جانے کیا سوچا آگے بڑھا اور عظیم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

چھوڑیئے بھائی جان! میں خود سامان اتارتا ہوں۔

عظیم نے انتہائی نگاہوں سے دیکھتے ہوتے کہا۔

دُور رہو مجھ سے۔ تم دونوں میرے لیے اجنبی ہو۔

قیصر چپ چاپ پیچھے ہٹ گیا۔ عظیم نے سارا سامان اتار کر نیچے رکھ دیا۔ عاصفہ نے بوڑھے ملازم کی طرف دیکھتے ہوتے کہا۔

ان کے لیے اندر فریج سے دو بوتلیں نکال لاؤ۔

بوڑھا ملازم بیچارہ پریشانی اور حسرت سے عاصفہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ عاصفہ نے دوبارہ بڑی قہرمانیت سے کہا۔ تم نے سنا نہیں مجھے کیا دیکھے جا رہے ہو۔ یہ اس گھر کے مالک اور میرے منگیتر ہیں۔ بوڑھا چپ چاپ اندر چلا گیا۔

اسی لمحہ آسیہ اپنے گھر کی طرف سے بھاگتی ہوئی آئی۔ اس نے بھی عظیم کو دیکھ لیا تھا۔ عظیم کے قریب آکر وہ بیچاری پر تاثیر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ عظیم کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ قمیض پھٹی ہوئی اور پتلون میلی تھی۔ وہ گرد آلود پسینے میں شرابور تھا۔ اس کی ہیبت غم آلود تھی اور اس کے چہرے سے انسانیت کش نظام کی پرچھائیاں تھیں۔ آسیہ عظیم سے قریب ہوتی بڑی وارفتگی سے پوچھا۔ آپ گھر سے بھاگ

کیوں گئے تھے؟

عظیم خاموش کھڑا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ آسیہ نے آگے بڑھ
کر اس کا بازو ہلایا میں آپ سے مخاطب ہوں۔ بولتے کیوں نہیں ہیں
پست و مضمحل سی آواز اور نیم دلی سے اس نے جواب دیا۔

یہاں اگر میں کانٹوں پر پڑا رہتا تو میرا ذہن ہمیشہ کے لیے مجروح
جاتا۔ اب مجھے سکون ہے اور میں ایک نئی زندگی کی ابتدا کر لی ہے
اسی لمحہ بوڑھا ملازم دو بوتلیں لے آیا اور عظیم کی طرف بڑھائیں۔ عظیم ان
کر گیا ——

میں نہیں پیونگا بڑے میاں!

عاصفہ نے اس سے بوتلیں لے لیں اور عظیم کی طرف بڑھی۔ دو
بوتلیں اس نے عظیم کی طرف بڑھاتے ہوتے کہا۔

پی لیجئے۔

عظیم نے دونوں بوتلیں تھام لیں۔ عاصفہ خوش ہو گئی۔ لیکن
دوسرے ہی لمحے اس کی روح میں گویا تلخیاں گھول دی گئی ہوں۔ ع
نے دونوں بوتلیں فرش پر پھینک کر ریزہ ریزہ کر دیں۔ اور پھر اِد
اُدھر بکھرے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
اُس نے عاصفہ سے پوچھا۔

کیا تم ان شیشے کے ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑ سکتی ہو —— ایک لمحہ

آہ بھرتے ہوتے عاصفہ نے کہا۔

نہیں۔

عظیم نے معاندانہ کھنک اور زہر بھرے انداز میں کہا۔

تو پھر سنو تمہاری طرف سے میرا ٹوٹا ہوا دل ان شیشوں کی مانند دوبارہ
نہیں جڑ سکتا۔ اس گھر میں —— اس گھر میں تم تیرگی کا ہجوم
ایک سیاہ پتھر ہو جس سے روشنی نہیں پھوٹ سکتی۔ عاصفہ کا سر جھک گیا۔
عظیم نے اس بار بوڑھے ملازم سے کہا۔

بڑے میاں میری مزدوری لاؤ۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن سے میں اپنا
مختانہ نہیں چھوڑ سکتا۔ عاصفہ ایک بار پھر اندر گئی اور اپنا پرس اٹھا لائی۔
عظیم کے قریب آ کر اس نے پرس کی زنجیر کھولی اور عظیم کی طرف بڑھاتے
ہوتے کہا۔

اس میں پانچ ہزار روپیہ ہے جس قدر آپ کو ضرورت ہے لے لیں۔
عظیم نے دس روپے کا ایک نوٹ نکال لیا اور پرس اس نے فرش پر
پھینکتے ہوتے کہا۔

میں صرف اپنی مزدوری لونگا۔ میں تمہارا احسان مند کیوں بنوں۔ عظیم
جب اپنا ٹھیلا کھینچ کر باہر لیجانے لگا تو آسیہ اس کے سامنے آگئی۔

کہاں چلے ہیں۔

غم آگیں دھن میں عظیم نے جواب دیا۔ مزدوری کرنے۔ آسیہ نے

اس کے دونوں بازو تھام لیے اور الفاظ کی رقت میں کہا۔

ابو کلینک گئے ہوئے ہیں۔ ان کے آنے تک آپ نہیں جائیں گے
قیصر بھی آگے بڑھا اور عظیم کو روکتے ہوئے کہا۔

آپ یہیں رہیں بھائی جان! یہ آپ کا گھر ہے۔

برف جیسے ٹھنڈے لہجے میں عظیم نے کہا۔

بھائی ؟۔ تم مجھے بھائی کہتے ہو۔ میں نے تمہارا نعم البدل تلاش کر لیا
ہے۔ تمہاری جگہ میں نے کسی اور کو بھائی بنا لیا ہے دیکھنا پسند کرو گے
اس نے اپنے کتے کو پکارا۔

قیصر! قیصر! کتا اپنے جسم کا پچھلا حصہ دہرا کرتا اور دم ہلاتا ہوا
عظیم کی طرف بڑھا اور اس کے پاؤں چاٹنے لگا۔ عظیم نے قیصر پر
طنز کیا۔

دیکھا کیسا ساتھی ہے ؟ تم سے ہر حال میں بہتر ہے۔ میں نے ایک
بار اسے روٹی کا خشک ٹکڑا ڈالا اور اس کے صلے میں میرے ساتھ اس
نے یہ رشتہ قائم کر رکھا ہے۔ پر تم ؟۔ میں تمہیں اپنا خون دیتا رہا۔ اپنی
محنتوں کا ثمر تمہیں کھلاتا رہا۔ اور پھر تم نے ہی مجھے زہریلے سانپ
کی طرح ڈس لیا۔

عظیم جب دوبارہ ریڑا کھینچنے لگا۔ تو آسیہ آپنے دونوں بازو پھیلا
کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

میں آپ کو نہیں جانے دونگی ۔

عظیم نے ایک ہیجان کے عالم میں کہا۔

آسی! کیا تم چاہتی ہو میں یہاں ساری عمر کانٹوں میں پڑا رہوں۔ تم چاہتی
ہو میں ساری عمر چنگاری کی طرح بھڑکتا رہوں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔
اسی پر میں یہاں رہ کر اپنی زندگی کا ضمیر زنگ آلود نہیں کرنا چاہتا۔ اس
گھر کے اندر میری تقدیر کے پامال راستے ہیں جن پر میں دوبارہ چلنا نہیں
چاہتا۔ اگر تمہیں مجھ سے ذرہ بھی ہمدردی ہے تو میری راہ سے ہٹ جاؤ۔

آسیہ نے کچھ سوچا پھر ایک طرف ہو گئی۔ عظیم اپنا ٹھیلا لیکر باہر
نکل گیا۔ سب گیٹ پہ کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ سڑک کنارے
کمیٹی کے نلکے کے قریب اس نے ٹھیلا روکا اور جھک کر چلو سے پانی
پینے لگا۔ اس کا کتا بھی حوض میں جمع پانی چاٹنے لگا تھا۔ آسیہ، عاصفہ
اور قیصر اس کی یہ حالت دیکھ کر اور زیادہ غمزدہ ہو گئے تھے۔

یکبارگی آسیہ اپنے گھر کی طرف بھاگی۔ گیراج سے اس نے گاڑی
نکالی اور سڑک پہ لائی۔ عاصفہ اس کے سامنے آتی ہوئی بولی۔

کہاں چلی ہو آسی!

ان کا پیچھا کرونگی۔ اور دیکھوں گی کہاں رہتے ہیں یہ
دروازہ کھولتے ہوئے عاصفہ نے کہا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی
ہوں۔ دونوں آہستہ آہستہ کار چلاتی ہوئیں۔ دور دور رہ کر عظیم کا

تعاقب کرنے لگیں۔

آج پھر اسے چرکا لگ گیا تھا۔ لہٰذا وہ جلدی مندر لوٹ گیا۔ آر
اور عاصفہ مندر تک اس کا تعاقب کر کے چلی گئی تھیں۔ ابھی شام نہ ہو
ٹھیلا املتاس نیچے کھڑا کر کے وہ سیڑھیاں چڑھا اور فرانسس کے
میں داخل ہوا۔ وہ اکیلے کمرے میں لیٹے ہوتے تھے۔ کمل اور سیبل
دوسرے کمرے میں تھیں۔ عظیم اس کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا
چند لمحوں تک اسے خاموشی سے دیکھتے رہے پھر کھوکھلی سی آواز
پوچھا ــــ

کمزور ہو گئے ہو؟

عظیم نے سر جھکاتے رکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ فرانسس پھر بو
شاید تم دن بھر ٹھیلا کھینچ کھینچ کر تھک جاتے ہو۔

عظیم خلاؤں میں کھو گیا۔

مزدوری سے تو نہیں تھکتا۔ پر ان نامساعد حالات نے میری
توڑ دی ہے۔ یہ دور گنہگار ضمیر رکھنے والوں کا ہے۔ کہیں بھی انسانیت
گرمی نہیں رہی۔ لوگوں کا سلوک ایک دوسرے سے برف جیسا ٹھ
ہو گیا ہے۔ اس دور میں جس سے محبت کی جاتے وہی رگ رگ میں
زہر گھول دیتا ہے۔

فرانسس نے پھر پوچھا۔

روز کا کیا کما لیتے ہو۔

کبھی پچیس تیس، کبھی چالیس اور کبھی کچھ بھی نہیں۔ مزدوری ہے مل
گئی ــــ مل گئی نہ ملی تو نہ سہی۔

ٹھیلے والوں کو کیا دیتے ہیں۔

ٹھیلا ان کا ہی ہے جن کے پاس میں مندر میں رہتا ہوں۔ جو کماتا ہوں
سب انہیں دے دیتا ہوں۔ ان میں ایک لڑکی ہے جس نے مجھے
بہن کا پیار دیا ہے۔ بس وہاں سے پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا ہے اور
مجھے کچھ چاہیئے بھی نہیں۔

اسی وقت کمرے میں کمل داخل ہوئی۔ اس نے چاتے کی ٹرے
اٹھا رکھی تھی۔ چاتے کا کپ اس نے عظیم کے سامنے میز پر رکھا اور سیبل
کو آواز دی سیبل جلدی لاؤ نا!

سیبل تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی ــــ وہ دو پلیٹیں اٹھائے
ہوئے تھی۔ ایک میں بھنی ہوئی مونگ اور دوسری میں آلو کے چپس
تھے۔ دونوں پلیٹیں اس نے عظیم کے سامنے رکھتے ہوتے کہا۔

کیسے ہیں بھائی جان!

عظیم مسکرا دیا۔ ٹھیک ہوں۔

سیبل نے دوبارہ اداسی سے کہا۔

بھائی جان! دیکھئے آپ کی ساری قمیض پھٹی ہوئی ہے۔ اسے تبدیل

کیوں نہیں کرتے۔ پہلے تو آپ کبھی ایسا لباس نہ پہنا کرتے تھے۔ عظیم
اسے پکڑ کر پیار کرنے لگا۔

کیا کر رہی تھی۔

چھت پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔

عظیم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جاؤ پڑھو جا کر۔ سیمل با
نکل گئی۔ کمل عظیم کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

فرانسس کی حالت یوں ہو رہی تھی۔ جیسے وہ دل ہی دل میں
رہا ہو۔ پھر اس کی آواز یوں سنائی دی جیسے کوئی آبی طوفان بند توڑ کر
اور ساری مخلوق، دنیا اور انام کو بہا لے جانا چاہتا ہو۔ وہ کمل سے
مخاطب ہوا۔

کمل! عظیم کو سو روپے دے دو۔ نئے کپڑے بنا لے گا۔ کمل
کرہ باہر نکل گئی۔ عظیم نے سخت احتجاج کیا۔ نہیں نہیں۔ میں نہ لونگا
کمل پھر کمرے میں داخل ہوئی اور دس دس کے نوٹ اس نے فرا
کو تھما دیئے۔ فرانسس نے نوٹ عظیم کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

میری خاطر رکھ لو عظیم۔ ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ عظیم نے نو
تھام لیے اور عجیب سے ابھڑے بجھڑے، لٹے ہوتے اور ویران ا
میں کمل کی طرف دیکھنے لگا۔ کمل اٹھی اور باہر چل دی۔ عظیم اسے دیکھتا
وہ اسے یوں لگ رہی تھی جیسے وہ سیال خوشبو بن کر بہہ گئی ہو۔

ات کے پہلے پہر کا کنوارا خواب جو ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا ہو۔

تھوڑی دیر تک عظیم فرانسس سے باتیں کرتا رہا پھر اجازت لے کر کھڑا
ہو گیا اور دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں کمل اکیلی بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی
ی۔ اس نے عظیم کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ بے تعلق ہو کر پڑھتی رہی۔ عظیم
خود ہی ایسی آواز میں بولا جو فکر مندی اور ترحم سے بھرپور تھی۔

کمل! جس راستے پر تم ان دنوں جا رہی ہو۔ اگر تم وہاں سے لوٹ آؤ
یں وعدہ کرتا ہوں میں تم تینوں کے اخراجات پورے کرتا رہونگا،
خواہ مجھے بک ہی کیوں نہ جانا پڑے۔

کمل نے گھور کر اس کی طرف دیکھا پھر بے نفس و بے غرض لہجے
یں کہا۔

حالات کا مارا ہوا وہ شخص جو خود اپنے اخراجات پورے نہ کر سکتا
ہو۔ دوسروں کا بوجھ کیسے اٹھائیگا۔

کنکریاں مارنے والے انداز میں عظیم نے پوچھا۔

تو تم اپنے آپ کو نہ بدلو گی؟

ہرگز نہیں۔

کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔

ہاں۔ مجھے کسی نصیحت کی ضرورت نہیں۔

کیا تم وہی کمل ہو جو کراچی میں میرے بغیر ایک پل نہ رہ سکتی تھی۔

کمل کی زبان غوطے کھانے لگی۔ وہ کمل مر چکی ہے۔

غلیم نے ہاتھ میں پکڑے ہوتے سو روپے کے نوٹ جو فرانس
نے اسے دیتے تھے۔ کمل کے منہ پر مارتے ہوتے درندگی میں کہا۔

تو پھر مجھے اس کمل کی تلاش ہے میں اسے ڈھونڈھ کر دم لونگا۔ تم لاکھ
بنو لاکھ اپنے آپ کو چھپاؤ ایک روز میں تمہیں اپنے آپ کو بدل لینے
پر مجبور کر دونگا۔ عظیم تیزی سے مڑھا اور باہر نکل گیا۔ کمل نے رسالہ
ایک طرف رکھ دیا اور اپنی بدبختی، بدحالی ورنجیدگی اور اپنی مجرد
کن حالت پر زار زار رونے لگی۔ عظیم جو روٹھ کر چلا گیا تھا — اس
کا اپنا عظیم — حالات نے بیشک اسے عظیم کے قابل نہ رہنے دیا تھا
پر وہ اب بھی عظیم سے محبت تو کرتی تھی نا — محبت جو ندیوں
کی روانی اور نور کے دریا کی طرح پرسکون ہے اور کبھی ایک بھگتاوا
اور سزا بن کر اذیت دہ بھی ہو جاتی ہے۔



عظیم نے اب مندر آنا کم کر دیا تھا۔ کمل کے سلوک نے اسے تلخ و
تاریک اور گریزاں ہستی بنا دیا تھا۔ اب وہ اکثر ہفتہ ہفتہ بھر باہر رہنے
لگا۔ کسی بازار کے کونے کھدرے میں وہ اپنا ٹھیلا کھڑا کر لیتا اور رات
کو وہیں سو رہتا۔ اس کا کتا بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ
گھر آتا اور شاموں یا رفعت کو پیسے دے جاتا اور انہیں مل بھی جاتا۔
اب وہ ہر طرف سے بیگانہ ہوتا جا رہا تھا۔

پورا ہفتہ باہر گزارنے کے بعد ایک روز وہ مندر واپس آیا۔ بوڑھا
شامو املتاس تلے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عظیم نے ریڑھ کھڑا کیا اور شاموں
کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ شاموں بڑی حسرت سے اسے کچھ دیر تک

دیکھتا رہا پھر بڑے دکھ سے کہا۔

ہم سے اتنی ہی نفرت ہو گئی ہے جو یہاں اب آتے ہی نہیں۔

عظیم نے املتاس کے خاکستری تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے رد
دینے والی آواز میں کہا۔ میں کسی سے کیا نفرت کروں گا۔ لوگ ہی مجھ سے
نفرت اور بیزاری کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ میں چھپتا پھرتا ہوں حالات کی ستم
ظریفیوں اور جبرہ دستیوں سے۔ یہ جگت، یہ سنسار، یہ انام یہ دنیا ہی
میرے لیے عذاب بن گئی ہے۔ بابا تم عمر رسیدہ، کہنہ سال اور تجربہ کار
ہو۔ بتاؤ میں کیا کروں۔

حقے کی نے ایک طرف کرتے ہوئے شامو نے غم آلود آواز سے کہا۔

میری کوئی اولاد نہیں میرے بچے! میں تو تجھے ہی اب اپنا بیٹا سمجھتا
ہوں۔ پر تمہارے حالات نے مجھے بھی الجھا دیا ہے کہ میں ان کا کوئی حل
نہیں سوچ سکتا۔ خدا جو رحیم بھی ہے۔ بھگوان جو رام بھی ہے۔ تمہیں صبر اور
سکون عطا فرمائے۔

عظیم بپھر گیا۔ خدا کسی کو کیا دے گا۔ جو غریب کی آہ بے اختتام آہ ہیں
نہیں سن سکتا۔ مظلوم کی موقع پر مدد نہیں کر سکتا۔ کیسا خدا ہے تمہارا جو
انصاف تلاش کرنے والوں کو انصاف نہیں دیتا۔ بے گناہوں کو انسان
کے بناتے ہوئے قانون کے سامنے بے گناہ ثابت نہیں کر سکتا۔

کمرے سے رفعت اور آفتاب نکل کر وہاں آ کھڑے ہوتے اور

عظیم کی باتیں سننے لگے۔ عظیم نے پہلے سے بھی سخت لہجے میں کہا۔

کہاں ہے خدا؟ — خدا ان کا ہے جو کتوں کی طرح غریبوں کا گوشت
نوچتے پھرتے ہیں۔

عظیم کی حالت طوفانوں جیسی ہو گئی۔ خدا ان کا ہے جو ہم محنت کشوں
کو بھیڑ بکری کی طرح ہانکتے ہیں اور بھیڑیے بن کر ہمارا خون پیتے ہیں —
میرا تمہارا خدا کہاں ہے بابا!

ہم اس جہان میں بھی گنہگار اور اس جہان میں مجرم — ہم یہاں بھی
ذلیل و خوار وہاں بھی رسوا و روسیاہ — ہم — ہم
ذلیل ہیں کمینے، نیچ، بے غیرت۔ بے حیا ہیں — کیونکہ ہم بے مایہ
جو ہوتے۔ رفعت اور آفتاب وہاں کھڑے رونے لگے تھے۔ شاموں
نے مدھم مدھم ہچکیوں میں روتے ہوئے کہا۔

شاید آج پھر کسی نے تمہارا دل توڑا ہے؟

عظیم نے جلتے اور ویران موسم کی سی اداسی سے کہا۔

تم بھی بھولے ہو بابا! ہم جیسے فرو ماندہ اور مسلے کچلے لوگوں کا بھی
دل ہوتا ہے؟ — ہم پتھر ہیں۔ گرم ہواؤں میں اڑتے بہتے
خشک تنکے ہیں۔

شاموں کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی اور سنبھلتا ہوا بولا۔ یہ اوپر کی
منزل میں جو بیمار اور بوڑھا فرانسس رہتا ہے نا۔ جس کے ہاں تم جاتے

رہتے ہو اس کی چھوٹی لڑکی کئی بار تمہیں بلانے آتی رہی ہے کہہ رہی
ابو بلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور لڑکی بھی کتنی بار تمہیں ملنے آ
رہی ہے۔

کون لڑکی ؟

اس نے اپنا نام عاصفہ بتایا تھا۔

عظیم کا سر جھک گیا۔ شاموں نے پھر پوچھا۔ کیا یہ وہی ہے جو کبھی
تمہاری منگیتر تھی اور تمہارے چھوٹے بھائی سے شادی کر لی تھی۔

عظیم کا سر جھکا رہا۔ دُکھ سے اس نے کہا۔ ہاں۔

قبل اس کے شاموں کچھ اور پوچھتا۔ رفعت ایک ہاتھ میں تانبے کی
کی چلپچی اور دوسرے میں پانی کا لوٹا لیکر آگئی۔ اس کی آنکھوں سے ابھی
تک آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اپنے ہونٹ سکیڑ سکیڑ کر ضبط کرنے کی
ناکام کوشش کر رہی تھی۔ چلپچی عظیم کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے
ڈوبتی اور لرزتی آواز میں کہا۔

ہاتھ دھو لیں بھیا اور کھانا کھائیں۔

وہ عظیم کے ہاتھوں پر پانی ڈالنے لگی۔ عظیم جب ہاتھ دھو رہا تھا۔
رفعت کی آنکھوں سے کئی آنسو نکل کر چلپچی میں گر گئے۔ عظیم نے بیتاب
ہو کر پوچھا تم رو رہی ہو منی!

رفعت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ طوفانوں میں

کانپتی ہوئی کچی اور نوزائیدہ شاخ کی طرح ۔ عظیم پھر بولا۔

میں نے اپنی بہن سے کیا پوچھا ہے ؟

رفعت نے پانی کا لوٹا ایک طرف رکھ دیا اور عظیم سے لپٹ کر دھاڑیں
مار کر روتے ہوئے اس نے کہا۔

بھیا! آپ خدا کے خلاف نہ بولا کریں۔ ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا
کریں۔ نہیں تو ایک روز آپ کی بہن مر جائے گی۔ شاموں نے رفعت کو
علیحدہ کیا۔ وہ سنبھلی اور عظیم کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ فرش پر اس
نے چٹائی بچھائی اور اس پر کھانا رکھ دیا۔ عظیم کھانا کھانے لگا۔ رفعت نے
دو روٹیاں اُٹھائیں اور باہر آکر عظیم کے کتے کے آگے ڈال دیں۔

عظیم نے ابھی آدھا کھانا ہی کھایا تھا کہ کمرے میں عاصفہ داخل ہوئی
عظیم کو فرش پر بیٹھے کھانا کھاتے دیکھ کر وہ بجھ سی گئی۔ عظیم نے ایک بار
نگاہیں اُٹھا کر عاصفہ کو دیکھا۔ پھر کھانا کھانے لگا۔ عاصفہ آپ ہی آپ عظیم
کے بستر پر جا کر بیٹھ گئی۔ عظیم جب کھانا کھا چکا تو عاصفہ فوراً اُٹھی اور اس
کے سامنے سے کھانے کے خالی برتن اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے۔ عظیم
نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا پر منہ سے کچھ نہ بولا۔ خاموشی
سے وہ اُٹھا اور باہر نکلنے لگا۔ عاصفہ اُٹھی اور اس کے سامنے کھڑی ہوتی
ہوئی بولی۔

میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

بڑے صبر سے کام لیتے ہوئے عظیم نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

کہو ؟

آپ پہلے وہاں بیٹھیں۔ عاصفہ نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔ عظیم کا یوں ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی ایک دھماکے سے پھٹ پڑے گا۔ تاہم بستر پر بیٹھ گیا۔ عاصفہ اس کے سامنے دوسرے بستر پر بیٹھی اور کانپتی آواز میں کہا۔

میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔

عظیم نے گلا صاف کیا ـــــ کیسی معافی؟ میں خود گناہ گار ہوں میں کسی کو کیا معاف کرونگا۔

گناہ گار تو میں ہوں آپ کی۔

تم کہنا کیا چاہتی ہو۔

غمگین اور دلگیر ہو کر عاصفہ بولی۔

میں آپ کو لینے آئی ہوں۔

کدھر؟

اپنے ساتھ لے جاؤنگی۔

عظیم جیسے یادوں کے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ میں یہاں خوش ہوں میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ تم اب جاؤ اور آئندہ کبھی ادھر نہ آنا۔ تم ایک شادی شدہ خاتون ہو۔ اور ایک شادی شدہ عورت کو غیر مرد

سے یوں ملتے شرم آنی چاہیئے۔ عظیم نے پھر طنز کیا تھا۔

عاصفہ رو پڑی۔

میں قیصر سے طلاق لے لونگی۔ میں اس کی بیوی نہ رہونگی۔ میں اس سے طلاق لے لونگی۔ اس سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی بھول ہے۔ میں شروع ہی سے آپ کو چاہتی تھی لیکن آپ چونکہ امی کی ہر بات آنکھیں بند کرکے مان لیتے تھے اس لیے مجھے گمان ہوا کہ شادی کے بعد میری کوئی وقعت نہ ہوگی۔ لہٰذا میں نے قیصر سے شادی کرلی۔ لیکن مجھے سکون نہ ملا۔ اب حالات بدل چکے ہیں اور میں آپ کو اس حالت میں مشقت کرتے نہیں دیکھ سکتی۔

عظیم نے ایسی آواز میں کہا جس میں دکھوں کی آہٹ تھی۔ میرے دل کا آبگینہ اب ٹوٹ چکا ہے ـــ تم ـــــ تم اب میرے زخموں کا اندمال نہیں ہو سکتی۔ تمہاری موجودگی میرے لیے اشتعال طبع کا باعث بنتی ہے۔

عاصفہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ مندر کی اس کوٹھڑی میں یخ بستہ اداسی بکھر گئی تھی۔ عاصفہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے بھیگے موتی تیر رہے تھے۔ جیسے یادوں کی لاش پر بیٹھی ماتم کر رہی ہو۔ کمرے پر سکون تھا۔ صبح کے خاموش اندھیروں کے سکون کی طرح۔ عاصفہ پھر خواب انگیز آواز میں بولی۔

آپ میرے ساتھ چلیئے نا۔

عظیم کے چہرے پر قہر کی ہولناکی اور غضب ناکی چھا گئی تھی۔ وحشـ
اور جنگلی قسم کے شفقتی رنگ اس کے چہرے کی ہیبت کو بدل گئے تو
پھر سپاٹ کھنکتی اور غصیلی آواز میں اس نے کہا۔

مجھے تم سے نفرت ہے۔ میں اب تمہاری شکل دیکھنا بھی پسند
نہیں کرتا دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

عاصفہ نے کوئی اثر نہ لیا اور وہیں بیٹھی محبت بھری نگاہوں سے
عظیم کو دیکھتی رہی۔

عظیم بل کھاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور زور سے چلایا۔ میرے نزدیک تـ
غلیظ اور گناہ آلود ہو۔ اٹھو اور دفع ہو جاؤ یہاں۔ ورنہ یہیں بیٹھی بیٹھی
کا گلا گھونٹ دونگا۔ عظیم نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔

اٹھو جاؤ۔

عاصفہ رو پڑی اور زور زور سے چلانے لگی۔

میں نہیں جاؤنگی۔ یہیں آپ کے قدموں میں جان دے دونگی
عظیم نے اسے زور کا دھکا دے کر کمرے سے باہر نکال دیا اور
کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے وہ دروازے سے پیٹھ
لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

عاصفہ دروازہ پیٹنے لگی اور عظیم دروازے سے پیٹھ لگائے
کھڑا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پرانی، قدیم اور گم گشتہ یادیں ایک
تیز دھار کی طرح اس پر برسنے جو لگی تھیں۔



اپنے کتے کے ساتھ کسی کا سامان چھوڑ کر وہ نیلم سینما سے چوک
ناخدا کی طرف آنے والی سڑک پر ریڑھا کھینچا چلا جا رہا تھا۔ اس کے
ٹھیلے کے پہیئے دائیں بائیں جھول کھاتے ہوئے کھڑ کھٹ کر رہے تھے
چوک پر آ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے سے ایک کار آتی تھی جس میں
ایک جوان مرد کے ساتھ کمل بیٹھی ہوئی تھی۔

عظیم ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے لگا۔ کمل نے اسے دیکھا نہ تھا۔
ایک دکان کے سامنے کار رک گئی اور کمل نیچے اتر کر اس مرد کے ساتھ
اس دوکان میں چلی گئی۔ شاید شاپنگ کرنے لگی تھی۔ اس کا گاہک جو تھا۔
عظیم نے ٹھیلا وہیں ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ اور خود ٹھیلے

سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس پر ہیجان خیزی طاری ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور فضاؤں سے تیرگی تانک جھانک کرنے لگی تھی۔ اس کی سانسوں کی تھکن بڑھ گئی تھی اور جسم سے پسینے پھوٹ نکلے تھے۔

اس کے ذہن میں جھکڑ چل نکلے تھے۔ حالات کی تلخیوں اور وقت کے مظالم کے۔ دل ڈوبنے لگا تھا۔ گویا کوئی اسے زنجیروں میں جکڑ کر دھوئیں گہرے تاریک اور سیاہ دھوئیں میں دور تک گھسیٹتا لے گیا ہو۔ اس نے ریڑھے کو یوں مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ جیسے وہ ابھی اسے اٹھا کر پٹخ دیگا اس کا جسم ہلکورے کھانے لگا۔ گہرے سمندر میں ڈوبنے والی بے بس و بے مددگار ناؤ کی طرح۔ اس کا کتا ریڑھے کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

اچانک اسے نہ جانے کیا سوجھی وہ اپنے ریڑھے پر کھڑا ہو گیا اور زور زور سے چلا کر چوک میں ادھر ادھر جاتے لوگوں کو اپنی طرف بلانے لگا

لوگو! میری ایک بات سنو!

میرے ایک سوال کا جواب دو لوگو!

تھوڑی دیر تک وہ چلا چلا کر لوگوں کو اپنی طرف بلاتا رہا۔ جب کافی تعداد میں لوگ اسکے سامنے جمع ہو گئے تو عظیم نے ہاتھ لہرا کر انہیں خاموش رہنے کو کہا۔ اتنی دیر میں کمل بھی اپنے ساتھی کے ساتھ دکان سے نکل آئی تھی۔ عظیم کو دیکھتے ہی کمل بیچاری وہیں کھڑی ہو گئی اور حسرت سے اس کی

طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھی نے اس کا گلابی گلابی بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

آؤ چلیں

کمل نے اپنا بازو چھڑا لیا اور غمزدہ لہجے میں کہا۔

ٹھہرو! دیکھیں یہ حالات اور وقت کا کچلا ہوا انسان کیا کہتا ہے۔ میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔ میری طرح اس کا بھی کوئی نہیں ہے

کمل خاموش ہو گئی۔ عظیم کی آواز بلند ہوئی تھی۔ لوگو۔ میں ایک حقیر، غلیظ اور پلید انسان ہوں پر میں تم سب سے ایک سوال کرتا ہوں بتاؤ

"خدا کہاں ہے؟"

مختلف آوازوں میں لوگ چلانے لگے۔۔

خدا ہے۔

عظیم نے پھر پوچھا۔ خدا کہاں ہے۔

لوگ خاموش ہو گئے۔ ایک سفید ریش بزرگ آگے بڑھے اور بڑے پیار سے کہا۔ خدا ہر جگہ موجود ہے بیٹے۔ وہ سب کچھ دیکھتا اور ہر بات کی خبر رکھنے والا ہے وہ دونوں جہانوں کا خالق و مالک ہے۔

عظیم گونجتے مگر تلخ لہجے میں بولا۔

لوگو! جو وجود اپنے ریوڑ کی صحیح نگہداشت نہیں کر سکتا کیا وہ پیر کہلا سکتا ہے؟ لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ نہیں۔ نہیں۔

کشتی کا وہ مالک جو کشتی چلانا ہی نہ جانتا ہو کشتی کا ناخدا کہلا سکتا ہے۔

لوگ پھر چلائے ـــ نہیں۔

علیم کی آواز بلند، دیوانہ وار اور بے لگام ہوگئی۔

وہ حاکم جو اپنی رعایا سے عدل و انصاف نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ایک انصاف پسند حکمران کہلا سکتا۔ ہے لوگوں نے پھر نفی میں جواب دیا۔ دوکان کے سامنے ستون کا سہارا لیکر کھڑی کمل رو دینے والی تھی۔

علیم پہلے سے بھی زیادہ گونجدار آواز میں بولا۔

تو پھر سنو لوگو! یہ دنیا چل رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ کوئی اس کا پیدا کرنے والا نہیں۔ کوئی خدا نہیں ہے۔ یہ دنیا نور و ظلمات کی جنگ کا دوسرا نام ہے۔ یہ دنیا ـــــــ یہ ـــــــ یہ آتش و خون کا قلزم زخار ہے۔ یہ بہتے لہو کا ایک نگر ہے یہ آب و گل کا ایک ایسا مرکب ہے جو کسی کے ہاتھ کی تخلیق نہیں ـــ اگر ـــــــ اگر اس جہاں کا کوئی پیدا کرنے والا ہوتا۔ کوئی اس کا خالق ہوتا۔ کوئی خدا ہوتا جسے اپنی اس تخلیق کلیوں کے دکھ درد کا احساس ہوتا تو اے ویرانہ حیات کے فرزندو! اس دنیا میں اس جہان میں تعصب کے زندان نہ ہوتے۔ جسموں کی گرمی اور سانسوں کی نرمی سے کھیلنے والے نہ ہوتے۔ کلیوں کا رس چوسنے والے بھنورے اور آبگینۂ احساس کو توڑنے والے نہ ہوتے ـ پھر جیسے علیم کے شعور پر جوالا مکھی اور کوئی آتش دہن پھٹ پڑا۔

اگر خدا ہے ـ اگر وہ اس دنیا کا خالق ہے تو پھر یہاں کیوں بھنورے

کلیوں کا کھیل جاری ہے۔ لوگ جب دوسرے کے آشیانوں کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔ تو کیوں خاموش رہتا ہے۔ اس نے اپنے ہونٹ پتھرا کیوں لیے ہیں۔ اس نے چپ کی بکل کیوں مار رکھی ہے۔ کیوں اس نے اپنے ہونٹ سی لیے ہیں۔ کمل اپنے ساتھی کو نظر انداز کرکے زار و قطار رونے لگی تھی۔

ہونٹوں کو تر کرنے کے لیے اپنی زبان علیم نے ہونٹوں پر پھیری اور زیادہ بہکتا چلا گیا۔

دل کے پھول یہاں کیوں مسلے جاتے ہیں ؟

لوگ شعور محبت سے نا آشنا کیوں ہیں ؟

کیوں ـــــــ کیوں یہاں انمول اور معصوم بٹیاں لوگوں کے ہاتھوں تنگ آکر کھلونوں کی طرح سستے داموں اپنی عزت بیچتی پھرتی ہیں دشواریوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کی ہزاروں بچیاں کیوں بک رہی ہیں ـ

جواب دو لوگو! مجھے جواب دو۔

ماں کی ممتا میں آنچ اور بہن کے خلوص میں رنگ کیوں نہیں رہا۔

باپ بے حس اور بھائی بے غیرت کیوں ہو گئے ہیں۔

اگر خدا ہے۔ اور اس نے اس دنیا کو پیدا کیا ہے تو کیوں اسے اپنی اس تخلیق کا احساس نہیں جو جل رہی ہے۔ کیوں اسے اپنے بندوں

کی رہبری اور ہدایت کا خیال نہیں جو درندوں کی طرح بھیانک اور وحشی ہو رہا ہے۔ کوئی خدا نہیں۔ کوئی خدا نہیں ہے لوگو!

کمل دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔ لوگ شور کرنے لگے تھے۔

تم جھوٹے ہو!

تم بکواس کرتے ہو۔ خدا ہے۔ وہ بے نیاز و لاشریک ہے۔

ایک بزرگ اونچی آواز میں بولے۔ شاید تلخ حالات نے تمہیں کچل دیا ہے اور تم بھٹک گئے ہو۔ مگر یاد رکھو خدا ہے۔ اس نے نیکی اور بدی کے دو راستے متعین کر دیئے ہیں اور مقررہ وقت تک انسانوں کو ان راستوں پر چلنے کی مہلت عطا کی ہے۔ یہ سوچنا انسان کا اپنا کام ہے کہ بدی کو چھوڑ کر نیکی کا راستہ اختیار کرے اس لیے کہ اللہ نے اسے عقل دی ہے

عظیم پھر بولا۔

یہ جھوٹ ہے۔ خدا نہیں ہے۔

یہاں ماں بک رہی ہے۔ بہن کا سودا ہو رہا ہے

کسی کی عزت اور کسی کا نشان مٹ رہا ہے

یہاں ——— یہاں ——— عظیم کو خاموش ہونا پڑا۔ لوگ اس پر آوازیں کستے ہوئے شور کرنے لگے تھے۔ بانت بانت کی بولیاں کانوں کے پردے ادھیڑنے لگی تھیں۔

یہ وطن دشمن ہے ــ اسلام دشمن ہے ــ دیریہ ہے۔ کمیونسٹ

مارو اسے مار دو سالے کو ــــ دشمن کا ایجنٹ ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ سی۔ آئی۔ اے کا ایجنٹ لگتا ہے۔ غدار ہے مارو اسے۔

دو تین پتھر اس پر آ کر گرے۔ پھر بے شمار لوگ سڑک کنارے سے پتھر اٹھا اٹھا کر اسے مارنے لگے۔ عظیم خاموش ہو گیا۔ اپنے ٹھیلے کے اوپر وہ اس مجسمے کی طرح خاموش اور ساکن کھڑا تھا جس کا وقت، مقام اور صناع خاموش ہو گئے ہوں۔ ہاں اس کا کتا پتھر پھینکنے والوں کی طرف منہ کر کے بھونک رہا تھا جیسے ——— جیسے ان سے اپنے مالک کے لیے اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔

کمل چونک اٹھی اور روتی ہوئی اپنی پوری رفتار سے عظیم کی طرف بھاگی۔ ساتھ ہی وہ لوگوں کو مخاطب کر کے چلا چلا کر کہتی جا رہی تھی۔

اسے نہ مارو لوگو! ـــ یہ مجبور ہے۔ بڑا بے بس انسان ہے۔ حالات نے اسے کچل دیا ہے۔ انہوں نے اسے روند دیا ہے۔ یہ ایک ایسا مظلوم انسان ہے۔ جو لوگوں کے ظلم تلے دب گیا ہے۔ اسے مت مارو لوگو! مت مارو اسے! کمل چاہتی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر عظیم سے لپٹ کر اسے پتھروں کی بوچھاڑ سے بچا لیگی۔

لیکن ——— لیکن اس کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی عظیم بے ہوش کر اپنے ریڑھے کے اندر گر گیا تھا۔ کمل اس کے پاس آئی، اور روتے ہوئے بڑی بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ ٹھیلے کے

اندر بے سدھ پڑا تھا اور اس کے دونوں بازو دو خشک ندیوں کی
طرح پھیل گئے تھے۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ زخم آ گئے تھے اور خون بہہ
رہا تھا۔ کمل کو جانے کیا سوجھی وہ ریڑھے پر چڑھ گئی اور لوگوں کے
ہجوم کو جو منتشر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مخاطب کر کے بولی۔

لوگو! میں ایک ایسی لڑکی ہوں جو مجبوریوں کے ہاتھوں اپنی عزت
بیچتی ہے۔ میں ہر روز بکتی ہوں اور تم ہی لوگ میرے ناموس کی قیمت
لگاتے ہو۔ تم ہی لوگوں نے میرا بازو پکڑ کر گناہوں کی اس بھٹی میں دھکیلا
تھا۔ کمل نے اپنے اس ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا جو ابھی تک اس
دوکان کے باہر کھڑا تھا۔

وہ شخص جو کار کے پاس تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ ابھی ابھی اس
نے میری عصمت کی قیمت چکائی اور بھیڑیوں کی طرح میرے جسم کو بھنبھوڑا
ہے۔ کمل کا وہ ساتھی کار میں بیٹھ کر بھاگ گیا۔

کمل پھر چلائی۔

لوگو! میں بھی کسی کی بیٹی ہوں کسی کی عزت ہوں۔ کسی کی بہن ہوں
کسی کے گھر کی روشن شمع ہوں۔ جس شخص کو تم لوگوں نے پتھر مار کر بے ہوش
کر دیا ہے۔ اسے میں جانتی ہوں۔ میری اور اس کی روح کا ایک
اٹوٹ رشتہ ہے۔ لوگو! جو کچھ اس نے کہا ہے سچ ہے۔ اگر
اگر خدا ہے تو کیوں اپنی موجودگی کا اظہار نہیں کرتا۔ عورت جو

قدموں تلے اس نے جنت رکھی ہے جب لوگ زبردستی اس کی عزت
کھیلتے ہیں تو وہ کیوں انصاف نہیں کرتا۔ خاموش کیوں رہتا ہے۔ گمنامی
دھند میں کیوں کھو جاتا ہے۔ کیوں ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا نہیں دیتا۔
گنہگاروں سے ان کے گناہ کی قیمت وصول نہیں کرتا۔

میں بھی خدا کو نہیں مانتی۔ میں بھی تم سے کہتی ہوں خدا نہیں ہے۔ مجھے بھی
لوگو! اتنے پتھر مارو کہ میں یہیں ختم ہو جاؤں اور گناہوں کی تاریک اور
اؤنی زندگی سے چھٹکارہ حاصل کر جاؤں۔ اسے مارا ہے تو مجھے بھی مارو لوگو!
بھی اس کی ہم خیال ہوں میرا بھی کوئی خدا نہیں ہے۔

کمل نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے
ی تھی۔ لوگوں کے سر جھک گئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ وہ منتشر ہونے
ے تھے۔ عجیب کھچا کھچا سا ماحول ہو گیا تھا۔ کمل نے اپنے چہرے سے ہاتھ
ائے۔ لوگ جا چکے تھے۔ کمل نے ایک بار عظیم کی طرف دیکھا پھر ریڑھے
ے اتری اور بھاگتی ہوئی ایک نل پر گئی اور اپنی ساڑھی کا پلو پانی میں بھگولائی۔
م کا منہ اس نے اوپر کیا اور پانی کے چھینٹے دیئے۔

عظیم نے آنکھیں کھولیں اور کمل کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر
کی طرف بیٹھ کرتے ہوئے اس نے دکھی آواز میں کہا۔

مرجانے دیا ہوتا مجھے۔

کمل منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ بچاری منہ میں ساڑھی کا پلو لیکر رونے لگی۔

عظیم نے پھر اس کے نازک دل پر نشتر چلایا۔

تمہارے یہ آنسو تمہیں بے گناہ ثابت نہیں کر سکتے۔ جاؤ چلی جاؤ۔ تمہارا گاہک کسی دوسرے چوک پر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔

کمل ہچکیاں لیکر رونے لگی۔ عظیم نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔

روتی کیوں ہو؟ ماتم کر رہی ہو اپنی لٹی ہوئی عصمت کا؟ جاؤ ڈوب مرو بوڑھے راوی میں۔ شہر کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں کیوں اپنے بوڑھے اور شریف باپ کی عواطف واعیال اور عزت ونجابت بیچتی پھر رہی ہو کیوں تم نسوانی شرف وناموس کو روندھ کر بدنامی کے جھنڈے نصب کر رہی ہو۔

کمل اس کے پیچھے بیٹھ گئی اور اپنے جسم کا سارا بوجھ عظیم پر ڈال دیا۔ اس کے انداز میں تفویض، حوالگی اور سپردگی تھی۔ وہ عظیم سے لپٹ کر کسی غیر آباد اور غیر مستعمل خانگاہ کی طرح اداس بیٹھی رو رہی تھی۔

عظیم کی آواز پھر کہیں دُور سے سنائی دی۔

کتنے پیسے لیے اس گاہک سے کتنے میں بیچا اپنا جسم۔ کیا قیمت لگائی تم نے اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کی عزت کی۔

ہچکیاں لیتی ہوئی کمل اُٹھی اور اپنی ساڑھی کے پلو سے عظیم کے زخم صاف کرنا چاہے۔ عظیم تڑپ کر ایک طرف ہو گیا اور غضبیلی آواز میں کہا۔

دُور رہو مجھ سے تم ــــ تم جہنمی خانہ اور ویران کھنڈر ہو۔ خالی سینہ اور پھٹا ہوا بادبان ہو۔ بے حیائی کا جامہ اور کانٹوں پر پڑا پھول ہو۔ دولت

نان کی خاطر تم نے حیوانی طلب اختیار کر لی ہے۔ تم نے اپنا ایمان بگاڑ لیا ہے تم گناہوں میں زندگی بسر کر رہی ہو۔ تم ــــ تم اپنا جسم نچوڑ کر لوگوں سے اپنا حرمت بہا وصول کر رہی ہو۔ جاؤ چلی جاؤ اور اپنے اسی گاہک کے گلے میں باہیں ڈالو جو تمہارے اس گلابی اور حسین جسم کی قیمت ادا کر چکا ہے۔ میں ایک بے بس اور کچلا ہوا انسان ہوں میں تمہارے جسم کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔

کمل نے آگے بڑھ کر عظیم کے پاؤں پکڑ لیے۔ چلیئے میں آپ کو ہسپتال لے چلتی ہوں۔ عظیم نے اپنے پاؤں چھڑاتے ہوئے کہا۔

مجھے ہسپتال نہیں قبرستان لے چلو اور گلا گھونٹ کر مجھے وہاں دفن کر دو تاکہ میں تمہیں جگہ جگہ عزت بیچتے نہ دیکھ سکوں۔

کمل عظیم کی گود میں گر گئی۔ معاف کر دیجئے میں نے آپ کو بہت دُکھ دیئے ہیں۔ پھر اس نے اپنا سر عظیم کی چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا۔

چلیئے اُٹھئے نا۔ ہسپتال چلیں۔

عظیم اسے اپنے آپ سے علیحدہ کر دیا اور بپھرتے ہوئے کہا۔

دفع ہو جاؤ یہاں سے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ کیا تم اس قابل ہو کہ کوئی شریف آدمی تمہارا ہاتھ تھام سکے۔ کیا تم نے اپنے آپ کو اس قابل رکھا ہے کہ کوئی بھلا مانس تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنا سکے۔

کمل رہڑے میں بیٹھ کر رونے لگی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور فضاؤں

میں روشنی کی لاش پر تاریک رات یوں بیٹھ رہی تھی جیسے انسانی لاش پر منہ
گدھ کمل کی ہچکیاں اور سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ عظیم رہڑے سے
اترا اور مدہم سی دکھتی آواز میں اس نے کمل سے کہا۔

نیچے اترو۔ میں نے جانا ہے۔

کمل ٹھیلے کے اندر لیٹ گئی اور روتی و بین کرتی ہوئی آواز میں کہا
کہیں لے چلیئے اور اپنے ہاتھوں سے دفن کر آیئے!

عظیم نے کچھ سوچا پھر اپنا رہڑہ کھینچنے لگا۔ جب گھر داخل ہوا تو عما
کے بیرونی دروازے کے قریب ہی کمل رہڑے سے اُتر کر اپنے گھ
گئی۔ عظیم نے املتاس تلے ٹھیلہ کھڑا کر دیا۔ اور اندر جانے کے بجائے رہڑ
کے پہیئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مندر کی کوٹھڑی سے شاموں، رفعت
آفتاب کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کا کتا بھی دُم ہلاتا ہ
کے پاؤں کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔

کافی دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا اور آنکھیں بند کیے رکھیں۔ شاید ا
گیا تھا بچارہ ۔۔ پھر کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ اس نے جب آ
کھولیں تو شاموں کھڑا تھا عظیم جب دوبارہ آنکھیں بند کرنے لگا تو شامو
پدرانہ شفقت سے پوچھا۔

کس وقت آتے ہو بیٹے!

عظیم نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔

پھر اندر کیوں نہ آئے۔

عظیم خاموش رہا۔ شاموں نے پھر پوچھا۔

آج کچھ اداس بھی زیادہ ہو؟

اثبات میں سر ہلاتے ہوتے دُکھ سے عظیم نے کہا۔

آج میں بہت پریشان ہوں بابا!

شامو طوفانوں میں ٹمٹماتے چراغ کی طرح بُجھ گیا۔ کیوں میرے بیٹے!

دل ٹوٹ گیا ہے۔

کوئی اپنا آدمی مل گیا ہوگا۔

ہاں بابا!

کون ملا؟

وہی ساتھی جس کی مجھے تلاش تھی۔

کمل؟

ہاں

کہاں ملی تھی۔

سر بازار اپنی عزت بیچتے اور اپنے جسم کا نیلام کرتے ہوتے۔ عظیم چند
لمحے خاموش رہا پھر دُکھتی آواز میں کہا۔

وہ ایسا زہر پینے کی عادی ہو گئی ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔

شاموں کی آواز دُکھ اور غم سے زنگ آلود ہو گئی تھی۔ یہ نفس بڑا بے دید

اور پلید ہے میرے بیٹے۔ انسان کے ضمیر میں یہ نہ جانے کیا کیا کرنے کی ہُ
پیدا کرتا رہتا ہے۔ صبر سے کام لو بیٹے! وقت ہی زخموں کا بہترین مرہم ہے
عظیم نے بڑے تکلیف دہ احساس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میرا تو جیون ہی مجھ سے روٹھ گیا ہے بابا! پریت کے ناطے ٹوٹ ر
ہیں۔ دشواریوں کی زنجیریں بُری طرح مجھے جکڑ رہی ہیں۔ یاس و ناامیدی کے
سیاہ ناگ میری طرف اپنے زہریلے پھن اُٹھانے لگے ہیں۔ اب تو زندگی
بن گئی۔ تنہا اور تپتے درخت کی طرح۔

شاموں نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

بُرے نصیبوں سے کیا شکوہ بیٹے۔ اسے اپنی تقدیر کے حروفِ ا
سمجھ کر قبول کر لو۔

عظیم اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

میں گھٹنے نہ ٹیکوں گا بابا! جب تک جسم میں روح ہے میں ایسے حالا
کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔

شاموں پھر بولا۔

تم آج پانچ روز بعد آتے ہو بیٹے! اس دوران تقریباً ہر روز تمہار
چچا سعادت اور ان کی لڑکی آسیہ تمہیں لینے آتے رہے ہیں۔ وہ دونوں بہ
پریشان تھے۔ وہ تمہیں بازاروں میں بھی تلاش کرتے رہے ہیں لیکن تم انہیں
ملے ——— شاموں کہتے کہتے رک گیا۔ کمرے کے اندر سے

رفعت کی آواز سنائی دی۔

کہاں بیٹھ گئے ہو بابا!

شاموں نے نیچی سی آواز میں کہا۔

عظیم آیا ہے بیٹی!

رفعت دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلی اور دروازہ اس نے کھلا ہی
رہنے دیا۔ رفعت عظیم کی طرف بھاگی۔ کمرے میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی اب
کھلے دروازے میں سے عظیم پر پڑ رہی تھی۔ تو وہ خوف سے کانپ گئی
عظیم بری طرح زخمی تھا۔ اس کی قمیض جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور سارے کپڑوں
پر خون کے دھبے تھے۔ رفعت گرتے گرتے بچی اور دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہائے میں مر گئی۔

شاموں نے فکرمندی سے پوچھا۔ کیا ہوا بیٹی۔

رفعت نے روتے ہوئے کہا۔

آپ نے بھیا کی حالت دیکھی ہے بابا! یا آنکھیں بند کر کے اس کے
پاس بیٹھے ہیں۔ شاموں نے عظیم کو خون آلود دیکھ کر چونکتے ہوئے پوچھا۔

کس نے تمہیں مارا ہے بیٹے!

اٹکتی اٹکتی سی آواز میں عظیم نے جواب دیا۔

اس دنیا والوں نے جو دل تو رکھتے ہیں پر دل کے نہاں خانوں میں انسانیت
کی محبت اور ہمدردی کا جذبہ نہیں رکھتے۔ رفعت زور زور سے رونے لگی تھی

شاموں کے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔ کمرے کے اندر سے آفتاب بھاگتا ہوا آیا۔
اور پریشانی سے پوچھا۔

تم لوگ رو کیوں رہے ہو بابا!

شاموں نے روتے روتے کہا۔

عظیم کی طرف دیکھو بیٹے! کسی نے اسے مار مار کر لہولہان کر دیا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں مر جاؤں گا بیٹے۔ شاموں نے اپنا سر اپنے دونوں گھٹنوں میں چھپا لیا اور بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔

رفعت سنبھلی۔ عظیم کا بازو پکڑ کر اُوپر اٹھاتے ہوتے کہا۔ چلئے بھیّا اندر چلیں سب اُٹھ کر اندر آ گئے۔ رفعت نے بڑے پیار سے پوچھا۔

کس سے جھگڑا ہوا ہے بھیّا!

زہریلی آواز میں عظیم نے جواب دیا۔

تمہارے خدا کی ایسی مخلوق سے جو حیوانیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

شاموں نے تڑپ کر پُوچھا۔

کیا تمہارا خدا نہیں ؟

میرا کوئی خدا نہیں ہے۔

میرے چند سوالوں کا جواب دو۔

پوچھو۔

پھولوں کی نازک پتیوں میں رنگ و خوشبو کون بھرتا ہے؟
رات کو آسمان پر ستاروں کے کاروان کون روشن کرتا ہے

کون ہے جو ہر روز بلا ناغہ سورج کو مشرق سے ہی طلوع کرتا ہے۔ مقررہ نت پر ایک منٹ آگے نہ پیچھے۔ وہ کون سی ہستی ہے جس نے چاند اور ورج کے راستے اور منزلیں مقرر کر رکھی ہیں کہ سورج کبھی خطِ استوا، کبھی خط لدی اور سرطان پر سفر کرتا ہے؟ گرمی کے بعد سردی اور خزاں کے بعد بہار ان لاتا ہے؟

یہ لہریں لیتے ہوتے سمندر، یہ فضاؤں کی وسعتیں اور حدِ نگاہ تک پھیلا وا نیلا آکاش۔ ان سب کے پیچھے کسی کا ہاتھ ہے کوئی انہیں کنٹرول کرتا ہے۔ ایک مشین ہی کو لو۔ ہر مشین کا ہر پرزے اور آلے کا کوئی نہ کوئی موجد اور ناع ہوتا ہے تو کیا تم سمجھتے ہی یہ کروڑوں میلوں میں پھیلی ہوئی کائنات ڈ ایک مشین ہی کی طرح ہے اس کا کوئی صناع اور موجد نہیں۔ ضرور ہے۔ ور وہی خدا ہے۔

عظیم خاموش رہا کوئی جواب نہ دیا۔ یوں لگتا تھا وہ شاموں کی باتوں ے متاثر ہوا ہو۔ شاموں نے ایک اور چرکا لگایا۔

میں جانتا ہوں تمہارے بُرے حالات نے تمہیں خُدا کے خلاف بولنے مجبور کر رکھا ہے۔ ورنہ مجھے یقین ہے تمہارا ضمیر اور تمہارا دل اس بات کو تسلیم رتے ہیں کہ خدا ہے۔

عظیم نے بے پرواتی سے کہا۔

ہوگا مجھے بھوک لگی ہے کھانا دو۔

رفعت نے آفتاب سے کہا۔

آفتاب! بھیا کو کو ساتھ لے جاؤ اور ان کے ہاتھ دھلا کرلاؤ۔ بھیا کھا
کھالیں۔ پھر انہیں ڈاکٹر کے پاس لیجاؤ اور پٹیاں کرالاؤ۔ آفتاب عظیم کا ہا
پکڑ کر غسل خانے نل کی طرف لے گیا۔

رفعت نے ڈوبتی ہوئی آواز میں شاموں سے کہا۔

بھیا کو حالات نے گمراہ کر دیا ہے۔ اس کا کوئی چارہ ہونا چاہیئے بابا
میں بھی اپنی طرف سے کوشش کرونگی کہ بھیا کو اور بھٹکنے نہ دیا جائے۔

شاموں نے سوچتے ہوتے کہا۔

میں اپنے محلے کی مسجد کے خطیب سے بات کرونگا۔ کسی روز جمعہ کے
روز عظیم کو گھر روک لیں گے۔ اور انہیں کہیں گے کہ وہ ایسا خطبہ دیں جس
خدا کا وجود ثابت ہو۔

ہاں بابا یہ ٹھیک ہے۔

عظیم منہ ہاتھ دھو آیا۔ رفعت نے پہلے اس کے کپڑے تبدیل کرا
پھر اسے کھانا دیا اور وہ کھانے لگا۔



رات آٹھ بجے کمل اپنے گھر جانے کے لیے عمارت کی سیڑھیاں چڑھنا ہی
چاہتی تھی کہ سیڑھیوں کی اوٹ سے ایک جوان سامرد نکلا اور کمل کا راستہ
روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بخشو تھا جو اسی عمارت میں رہتا تھا اور جوا کھیل کر گزر
بسر کرتا تھا۔ غصے کی حالت میں کمل نے اسے پیچھے ہٹانا چاہا لیکن اس نے
کمل کا بازو پکڑ لیا۔ اور لچوں لفنگوں کے لہجے میں کہا۔

میری ایک بات سنتی جاؤ۔

ایک جھٹکے سے کمل نے اپنا بازو چھڑا لیا۔ کہو۔

مجھے پتہ چل گیا ہے تم باہر ٹیوشن پڑھانے نہیں اپنی عزت بیچنے
جاتی ہو۔ کمل نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک طرف سے ہو کر سیڑھیاں چڑھنے

کی کوشش کی مگر بخشو نے آگے ہو کر راستہ روک لیا اور غصے میں کہا۔

میری پوری بات سن کر جاؤ ورنہ پچھتاؤ گی۔

کمل خاموش رہی۔ بخشو نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور کمل کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

بولو کیا قیمت لگاتی ہو اپنے اس حسین جسم کی

کمل نے غصے میں اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔ بکواس نہ کرو۔

بخشو نے طنزاً کہا۔ ناراض کیوں ہوتی ہو۔ دوکاندار کو سودا بیچنے سے غرض ہوتی ہے۔ گاہک کے اچھا بُرا ہونے میں وہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

کمل نے بیزاری سے کہا۔ مجھے جانے دو۔

بخشو ڈھیٹ ہو گیا۔ نہیں جانے دیتا۔ بلالو جسے بلانا ہے۔ اس عمارت میں اگر تمہارا کوئی حمایتی ہے تو اسے آواز دے لو۔ دیکھتا ہوں کون میرے سامنے آنے کی جرأت کرتا ہے۔ آج رات ہر حالت میں تمہیں میرے کمرے میں چلنا ہوگا بخشو نے ذرا جھک کر جب کمل کو اُٹھانا چاہا۔ تو کمل نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنی پوری طاقت سے بخشو کو دھکا دے کر دُور گرا دیا اور پھر بڑی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر چلی گئی۔

فرانسس کے کمرے میں جا کر وہ بیٹھ گئی۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا فروٹ کا لفافہ اور اپنا پرس تپائی پر رکھے اور فرانسس کے سرہانے بیٹھی ہوئی سیبل سے کہا۔

کھانا تیار ہے بے بی!

ہاں باجی

تم نے کھا لیا ہے۔

نہیں۔ آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔

جاؤ پھر یہیں لے آؤ۔ میں ابو کے لیے فروٹ لگاتی ہوں اور یہیں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ سیبل باہر نکل گئی تو فرانسس نے کمل سے کہا۔

جلدی آجایا کرو بیٹی! میں تمہاری طرف سے بڑا پریشان رہتا ہوں۔

کمل نے بے پروائی سے کہا۔ بس دیر ہو جاتی ہے۔ ابو۔ ٹیوشنیں جو زیادہ ہو گئی ہیں۔

عظیم سے کہیں ملاقات ہوئی؟

جی نہیں

فرانسس نے بڑی آس سے کہا۔

نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ پچھلے کئی روز سے میں سیبل کو لگاتار مندر بھیجتا ہوں۔ لیکن وہ کہتے ہیں عظیم پچھلے کئی روز سے یہاں آ ہی نہیں رہا۔ میرا دل اس سے اداس ہو گیا ہے۔ اب کی بار آیا تو میں اس سے شادی کی بات کرونگا۔ میں اسے کہونگا میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ کمل تمہاری امانت ہے اسے اپنے ساتھ لے جاؤ جہاں مرضی رکھو۔ اپنے گھر چاہے مندر۔ اگر وہ یہیں ہمارے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو گیا تو اور بہتر ہوگا۔ میری بیٹی! تمہاری عظیم

سے شادی ہو گئی تو میں سکون سے مر سکوں گا۔

کمل کچھ کہنے والی تھی کہ بخشو کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے سیبل تھی۔ وہ سخت پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ کمرے میں آکر بخشو نے ایک غلط اور غلیظ نگاہ کمل پر ڈالی اور فرانسس کو مخاطب کر کے کہا۔

انکل! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں؟

کمل پیلی پڑ گئی اور خوف سے اس کا جسم کپکپانے لگا۔ فرانسس نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بیٹھو! اور کہو کیا کہنا ہے۔

کمل سیبل کا بازو پکڑ کر اُٹھی کمرے سے دونوں بہنیں نکلیں اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر بخشو کی گفتگو سننے لگیں۔ فرانسس کی آواز سنائی دی۔

کیا کہنا ہے۔

بخشو نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

تم جانتے ہو تمہاری بیٹی کمل کیا دھندہ کرتی ہے جس سے وہ گھر کے اخراجات چلا رہی ہے۔

ٹیوشن پڑھاتی ہے بچاری

بخشو نے غصے میں کہا۔

یہ جھوٹ ہے وہ عزت بیچتی ہے۔

فرانسس نے اپنی پوری آواز سے چلاتے ہوئے کہا۔

بخشو بلا سوچے سمجھے میری بیٹی کو اتنا بڑا الزام نہ دو۔

میں اس کا ثبوت مہیا کر سکتا ہوں۔ اپنی بیٹی سے قسم دیکر پوچھو کیا وہ ایک اینگلو انڈین عورت کی وساطت سے طوائف کا دھندہ نہیں کرتی۔ وہ عورت جو تمہاری طرح کرسچین ہے۔ بھاری بھاری رقموں کے عوض تمہاری بیٹی کے لیے گاہک تلاش کرتی ہے۔

بخشو نے زور دے کر کہا۔

خدا کی قسم تمہاری بیٹی عزت بیچتی ہے۔ وہ ایک چلتی پھرتی طوائف ہے جو بھاری رقموں کے عوض اپنا جسم بڑے لوگوں کے ہاتھوں بیچتی ہے۔ میری بالکل یقین کرو نہ کرو تمہاری مرضی پر ایک بات ضرور ذہن میں بٹھا کر رکھنا اس عمارت میں شریف لوگ رہتے ہیں اور وہ یہ بات کبھی برداشت نہ کریں گے کہ ایک سلجھی ہوئی پڑھی لکھی لڑکی کے روپ میں یہاں اس عمارت میں عزت فروش، اوباش، قمامہ اور طوائف پیشہ لڑکی رہے۔

بخشو اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ اور سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو کر وہ اپنی لگائی ہوئی آگ کا ردِ عمل دیکھنے کا انتظار کرنے لگا۔ فرانسس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ غصے میں وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں تب ایک دم ہی اس کی آواز گونجی۔

کمل! کمل! یہاں میرے پاس آؤ۔

کمل سر جھکائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے سیبل بھی تھی مجرموں

کی طرح چلتی ہوئی کمل فرانسس کے پاس آئی اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ فر
کو گھورتے جا رہی تھی۔ فرانسس نے غصے میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔

بخشو نے جو الزام تمہیں دیا ہے وہ سنا تم نے ؟

کمل نے مجرموں کے انداز میں کہا۔ ہاں ابو!

کیا اس نے سچ کہا۔ جھوٹ نہ بولنا تمہیں باپ کی عزت اور بائیبل کی قسم
کمل خاموش رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ فرانسس کی تل
اور بڑھ گئی۔ میں تمہارے منہ سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔

کمل کا جسم کانپ رہا تھا۔ جیسے تیز طوفانوں میں درخت جھوم رہے ہوں
اس کی پھٹی پھٹی سی لرزتی آواز سنائی دی۔

یہ سچ ہے ابو!

فرانسس زور سے دھاڑا

لیکن ایسا کیوں ہوا ؟

کمل کھل کر ہچکیوں میں روتے ہوئے بولی۔ یہ سب کچھ چند مجبوریوں
کے تحت ہوا ہے ابو!

فرانسس چارپائی سے اٹھا اور پھر لگا تار کئی طمانچے اس نے کمل کے
منہ پہ دے مارے۔ کوئی مجبوری نہ تھی۔ اس سے تو بہتر تھا ہم بھوکوں
جاتے۔ بے شرم تم عظیم جیسے ستھرے انسان کو اب کیا منہ دکھاؤ گی۔
بیچاری لرز کر فرش پر گر گئی۔ اور فرانسس غصے میں اسے پاؤں کی ٹھوکر

مارنے لگا۔ کمل روتے روتے مار کھا رہی تھی۔ قریب ہی کھڑی سیبل زور زور سے
رونے لگی تھی۔

ایکدم فرانسس کو کچھ ہوا وہ اپنا ہاتھ اپنے دل پر لے گیا اور ڈگمگانے لگا پھر
دھم سے فرش پر گر گیا۔ کمل تڑپ کر اٹھی اور اپنے باپ کو سنبھالنے لگی۔ لیکن
اب وہاں کیا رکھا تھا۔ فرانسس کی حرکت قلب بند ہو چکی تھی اور وہ مر گیا تھا۔

سیڑھیوں پر کھڑا انجشو بھاگ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ دونوں بہنیں
باپ کی لاش سے لپٹ کر رونے لگی تھیں۔ کمل زور زور سے بین کرتی ہوئی رو
رہی تھی —

ابو ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلئے۔ کیوں ہمیں تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ
کے بعد اس دنیا میں ہمارا کون ہے۔ کون ہمارے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھیگا۔
کوئی نہیں ابو کوئی نہیں۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلئے۔
ہمارا تو خدا بھی نہیں ہے۔

عمارت کی کافی عورتیں وہاں جمع ہو گئی تھیں اور دونوں بہنوں کو تسلی دینے
لگی تھیں۔ کچھ لوگوں نے دری کا انتظام کر کے نیچے بچھا دی تھی اور افسوس کرنے
والے مرد وہاں آکر بیٹھنے لگے تھے۔ دونوں بہنیں ساری رات باپ کی لاش
سے لپٹ لپٹ کر روتی رہیں۔ دوسرے روز عمارت والوں نے مل کر فرانسس
کا کفن دفن کر دیا۔

باپ کی قبر سے جب دونوں بہنیں واپس آئیں اور سیڑھیاں چڑھ کر

اپنے گھر جانے لگیں تو کمل نے دیکھا۔ عمارت کے احاطے میں بہت سے لوگ
جمع تھے۔ عورتیں کھڑکیوں اور بالکونیوں میں کھڑی تھیں اور بخشو احاطے میں جمع
مردوں کو زور زور سے کہہ رہا تھا۔

محلے والو! عزت دارو

ماؤں بہنوں والو! بہو بیٹیوں والو!

مرحوم کی لڑکی جس کا نام کمل ہے۔ عزت بیچتی ہے اور یہ بات ہم سب
کے لیے بدنامی اور خطرے کا باعث ہے یہاں سب کی جوان بیٹیاں ہیں خربوزے
کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ایک مچھلی پورے جل کو گندہ کرتی ہے۔ آنے
والے اس وقت کا خیال کرو جب بدنامی کی یہ سیاہی دوسروں کے منہ پر بھی لگ
جائے گی۔ بدی کی یہ کالک کتنے اوروں کا بھی منہ لتھڑ دے گی۔

بخشو اور زور سے چلایا۔

یہ عمارت کی دوسری لڑکیوں کو بھی خراب کرے گی۔ یہاں گندگی پھیلائے گی۔
بدمعاش لوگ اس عمارت کو فحاشی کا اڈہ سمجھ کر اس کے گرد چکر لگانا شروع کر
دیں گے۔ اس طرح کسی بھی بہو بیٹی کی عزت محفوظ نہ رہے گی۔ اگر آنے والے
اس سیاہ وقت سے بچنا چاہتے ہو تو میری مانو۔ اسے یہاں سے نکال دو۔ کہیں
اور چلی جائے۔

لوگ طرح طرح کے فیصلے سنانے لگے۔

ہاں ہاں اسے یہاں سے نکال دو۔

سب کی عزتیں ہیں یہاں گند پڑ جائیگا۔

اسے کہو کہیں اور چلی جائے۔ اس عمارت میں نہیں رہ سکتی۔

اچانک بوڑھا شامو اپنی بیساکھیاں ٹیکتا ہوا ہجوم سے نکلا اور لوگوں کو
مخاطب کر کے بولا۔

لوگو! یہ ظلم ہے۔ اس کا باپ مر گیا ہے۔ یہ ایک بے بس لڑکی ہے۔ تم لوگوں
نے اگر اسے یہاں سے نکال دیا تو یہ بیچاری اور زیادہ گناہوں کی عادی ہو جائے گی
ہمیں چاہیئے اسے سہارا دیں۔ اس نے جو کچھ کیا ہے مجبوریوں کے تحت کیا ہے۔ میں
اس سے بات کر چکا ہوں۔ وہ ایک باعزت اور شریف باپ کی لڑکی ہے۔ وہ ضرور
سنبھل جائے گی۔ یہاں سے نکل کر وہ خبر نہیں کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔
سیڑھیوں پر کھڑی کمل سب کچھ سن رہی تھی اور رو رہی تھی۔ کھڑکیوں اور بالکونیوں
میں جمع ہونے والی عورتیں اونچی اونچی آوازوں میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔

بیچاری بے آسرا ہے اسے یہاں سے نکالنا ظلم ہے۔

چہ چہ چہ بیچاری کہاں جائے گی۔ کہاں سر چھپائیگی

ایک بوڑھی عورت نے غصے میں چلا کر کہا۔

شامو ٹھیک کہتا ہے۔ اسے مت نکالو یہاں سے۔ پڑا رہنے دو۔ تم اگر اس
کی مدد نہیں کر سکتے تو یتیموں پر ظلم کیوں کرتے ہو۔ خدا کے خوف سے ڈرو۔

کمل نے سیبل کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں بہنیں اوپر چلی گئیں۔ بخشو نے پھر
بکنا شروع کیا۔

میں اس عمارت سے گندگی نکالنا چاہتا ہوں اور تم لوگ اپنے ہاتھوں سے گندگی پھیلانا چاہتے ہو۔ اگر اسے یہاں رکھا گیا تو میں پولیس کو اطلاع کر دونگا اور بتا دونگا۔ یہ لڑکی پیشہ کراتی ہے۔

شاموں نے چلا کر کہا۔

تم ظالم ہو۔ وہ سب کی بیٹی ہے۔ اسے اس وقت سہارے کی ضرورت ہے

بختو کسی غلیظ اور خارش زدہ کتے کی طرح بھونکا۔

اس کی مظلومیت کا اتنا ہی خیال ہے تو اپنے گھر لے جاؤ۔ تمہارے پاس بھی ایک ہٹا کٹا لڑکا رہتا ہے جسے تم نے اپنا بیٹا بنا رکھا ہے۔ اسے اس سے بیاہ دو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بولو کیا اس گندگی کو تم اپنے ہاں سمیٹتے ہو۔

شاموں نے اپنی بوڑھی چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ میرے عظیم کو آ لینے دو۔ میں اسے اس سے شادی پر رضامند کر لوں گا۔ بختو کی شہ پر عمارت کے زیادہ تر مرد شور کرنے لگے۔

وہ یہاں نہیں رہیگی۔

اگر وہ نہ گئی تو ہم دھکے دیکر نکال دیں گے۔

اتنے میں سیڑھیوں پر کمل اور سیبل نمودار ہوئیں۔ کمل نے لرزتی آواز میں کہا۔

لوگو! میری خاطر جھگڑا نہ کرو۔ میں خود ہی یہاں سے جا رہی ہوں۔

کمل سیبل کے ساتھ اپنا مختصر سا سامان اٹھاتے عمارت سے نکل گئی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بوڑھا شاموں اپنی بیساکھیاں ٹیکتا ہوا مندر کی طرف چلا گیا تھا۔



شب کے تاریک و سیاہ سائے پھیل رہے تھے۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں درندوں کی طرح دھاڑ رہی تھیں۔ اودھے اودھے سے بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ شفق میں ڈوبے بادلوں کے ٹکڑے فطرت کے اسرار کی پردہ کشائی کر رہے تھے۔ فضاؤں میں۔ ہواؤں میں نیچر کے حسین اور البیلے آواز نغمے بکھر گئے تھے۔ عظیم آج کئی روز بعد مندر لوٹ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا ٹھیلا کھینچ رہا تھا اور اس کا کتا ٹھیلے کے اندر لیٹا ہوا تھا۔

جب وہ سرکلر روڈ پر آیا تو پیچھے سے کسی نے اسے آواز دی۔

عظیم بھیا!

وہ رک گیا اور مڑ کر پیچھے دیکھا۔ قیصر آرہا تھا۔ غلیم کے پاس آکر وہ رک گیا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور حالت فقیروں جیسی ہو رہی تھی۔ غلیم چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ قریب آیا اور رونی سی آواز میں کہا۔

بھائی جان! خدا کے لیے آپ یہ کام چھوڑ کر گھر چلیں۔ میں برباد ہو چکا ہوں۔ عاصفہ نے مجھ سے علیحدہ ہو کر کہیں اور رہائش اختیار کر لی ہے اور اب وہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔

سوکھے روکھے لہجے میں غلیم نے پوچھا۔

تو میں کیا کروں؟

قیصر نے منت کی۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں بھائی جان! وہ پھر آپ سے محبت کرنے لگی ہے۔ اور آپ ہی کی خاطر وہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میں خالہ کے پاس بھی گیا تھا۔ اس نے کہا ہے یہ تم دونوں کا معاملہ ہے۔ انکل نے بھی بہت سمجھایا لیکن وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

غلیم نے بیزاری سے کہا۔ مجھے تم دونوں سے نفرت ہے۔ وہ میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اسے دھکے دیکر نکال دیا تھا۔ جاؤ ڈھونڈتے پھرو اسے۔

قیصر نے آگے بڑھ کر اس کا ٹھیلا پکڑ لیا۔

میں آپ کو یہ کام نہ کرنے دونگا۔

غلیم کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو گیا۔ خصومت کے کئی رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ ایک بھرپور طمانچہ اس نے قیصر کے منہ پر مارتے ہوئے

استحقار سے اس نے کہا۔

نیچ کمینے! تم مجھ سے میرا یہ آخری سہارا بھی چھیننا چاہتے ہو جس سے میں اپنے پیٹ کا دوزخ بھرتا ہوں۔ تم نے پہلے ہی مجھے ریشۂ ظلمی سے نکال کر غم اور شقاوت میں پھینکا۔ اپنی مسرت کی جستجو میں تم میری ذہنی تباہی کا باعث بنے۔ اب پھر تم مجھے اسی بھٹیار خانے اور نیلام گھر لیجانا چاہتے ہو جہاں میں پہلے ہی ایک بار بک چکا ہوں۔ جاؤ چلے جاؤ میرا تم سے کوئی ناطہ نہیں ہے۔ اب تم پر مصیبت پڑی ہے تو میں بھائی بن گیا ہوں۔ پہلے تم کہاں تھے۔ قیصر خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور غلیم ریڑھ کھینچتا ہوا تاریکی میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ گھر داخل ہوا۔ ٹھیلا اس نے تلے کھڑا کر کے وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اندر انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی جس کے گرد شامو رفعت اور آفتاب بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک مونڈھے پر عاصفہ بیٹھی ہوئی تھی۔ غلیم کو دیکھتے ہی شامو نے حقہ ایک طرف ہٹا دیا اور پدرانہ شفقت میں کہا۔

شکر ہے میرا بیٹا گھر تو لوٹا ہے۔

رفعت نے روٹھنے کے انداز میں پوچھا۔

بھائی جان! ہم سے اتنی ہی نفرت ہو گئی جو کئی کئی روز آپ ملتے ہی نہیں۔ غلیم نے عاصفہ کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرایا اور جیب سے کئی مڑے تڑے نوٹ نکال کر رفعت

کو تھما دیتے۔

یہ سنبھالو! اور کھانا دو سخت بھوک لگی ہے۔ تم لوگوں نے کھانا کھایا کیا؟

نہیں بھیا! ہم تو ہر روز آپ کا انتظار کرتے ہیں۔ جب مایوس ہو جاتے کہ آپ نہیں آئیں گے پھر جا کر کھانا کھاتے ہیں۔ رفعت کھانا لگانے لگی تھی کہ شاموں بول پڑا۔

وہ اُوپر والا بوڑھا تو تمہیں یاد کرتے کرتے ہی مر گیا۔ روز اپنی چھوٹی بچی کو تمہیں بلانے بھیجا کرتا تھا۔

چونک کر عظیم نے پوچھا۔ کون بوڑھا۔

وہی فرانسس جس کے ہاں تم اکثر جاتے رہتے تھے۔

عظیم کی آواز جیسے گلے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ فرانسس مر گیا؟

ہاں مر گیا بیچارہ

اور اس کی دونوں لڑکیاں؟

انہیں بخشو نے یہاں سے بدنام کر کے نکلوا دیا ہے۔

کون بخشو؟

وہی بدمعاش جو نیچے کی منزل میں رہتا ہے اور جوا کھیلتا ہے۔

اس نے کیوں نکالا؟

اس نے شور کرنا شروع کر دیا تھا کہ بڑی لڑکی عزت بیچتی ہے۔ اس نے کہا اے تمہیں اس اینگلو انڈین عورت کو بھی جانتا ہوں جو اس کے لیے گاہک ڈھونڈا کرتی ہے۔ بخشو نے بھی اس کی عزت سے کھیلنا چاہا پر اس لڑکی نے انکار کر

یا۔ جس پر بخشو نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ سنا ہے وہ بیچاری عزت بیچ کر گھر ے اخراجات کے علاوہ اپنے بیمار باپ کا علاج بھی کرا رہی تھی۔

اس کے باپ کو اس کا علم نہیں تھا۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس کی بیٹی ٹیوشن ڑھانے جاتی ہے۔ اسے جب پتہ چلا کہ اس کی بیٹی عزت بیچتی ہے تو وہ اس دمے سے دم توڑ گیا۔ محلے والوں نے مل کر اس کا جنازہ کیا۔ اور دونوں لڑکیوں و یہاں سے نکال دیا۔ میں نے بہت روکا۔ عمارت کے لوگ بھی شاید مان جاتے بخشو نے سارا کام خراب کیا۔ اس نے ہی لوگوں کو ہوا دی اسے نکال دو ورنہ را محلہ خراب ہو جائے گا۔

اب خبر نہیں بیچاری دونوں بہنیں کہاں دھکے کھا رہی ہونگی۔ بڑے ظالم ل ہیں یہ نہیں سوچتے چاہے اس سے اگر گناہ ہو ہی گیا تو اس کی مدد کر کے اس ی اصلاح کر دی جاتی۔ بیہودوں نے اسے یہاں سے نکال ہی دیا تاکہ گناہوں ی دھسان اور دلدل میں اور زیادہ پھنس جاتے۔ واہ رام! کیسا جگت ہے یہ۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔

غصے میں کانپتی آواز میں عظیم نے پوچھا

بخشو کہاں ہے؟

یہیں ہے۔ تھوڑی دیر قبل ہی کہیں سے لوٹا ہے۔ جوا کھیل کر ہی آیا ہوگا۔

ذرا اٹھ کر مجھے اس کا کمرہ دکھاؤ۔ میں اس سے بات کرونگا۔ شاموں نے ظیم کے اطوار دیکھتے ہوئے کہا۔

چھوڑ اب مٹی ڈالو اس معاملے پر۔ بیٹھو کھانا کھاؤ۔

مجھ پر اس وقت تک کھانا حرام جب تک بخشو سے بات نہ کرلوں
نے اپنی بیساکھیاں سنبھالیں اور عظیم کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا۔ عاہ
رفعت اور آفتاب بھی ان دونوں کے پیچھے پیچھے تھے۔ ایک کمرے کی ط
اشارہ کرکے شاموں نے کہا وہ ہے بخشو کا کمرہ۔

عظیم آگے بڑھا۔ پاؤں کی ایک سخت ٹھوکر مار کر اس نے دروازہ کھ
اندر بھیانک چہرے والا بخشو بیٹھا نوٹ گن رہا تھا۔ جوا جیت کر آیا ہوگا
غصے میں گرجا۔

باہر آؤ بخشو۔

اس نے جلدی جلدی نوٹ سنبھالے اور کھڑا ہوگیا۔

کیا بات ہے؟

باہر آؤ پھر بتاتا ہوں۔

بخشو باہر آیا۔ عظیم اسے پکڑ کر شاموں کے پاس گیا۔

یہی بخشو ہے بابا!

یہی ہے بیٹے۔

عاصفہ، رفعت اور آفتاب بڑی پریشانی سے عظیم کی طرف دیکھ رہے
عظیم نے بخشو کا گریبان پکڑتے ہوئے پوچھا۔

تم نے کمل کو یہاں سے کیوں نکالا؟

بخشو نے بھی عظیم کا گریبان پکڑ لیا اور بازاری انداز میں دھمکی دی۔

دیکھو مہاشے! میرے ساتھ بدمعاشی نہ کرنا۔ ورنہ یہیں کھڑے کھڑے ایسا
لتاڑوں گا کہ اپنا ٹھیلہ کھینچنا بھول جاؤ گے۔

عظیم نے ایک زوردار دھکے سے بخشو کو اپنی طرف کھینچا۔

گندی نالی کے ذلیل کیڑے! تم آج تک حرام کھاتے رہے ہو۔ اور میں
زدوری کرکے اپنا پیٹ پال رہا ہوں۔ آج دیکھنا میرے جیسے محنت کش کے خون
ں اخلاقی جرآت اور حرات زیادہ ہے یا تم جیسے حرام خور کے خون میں۔

اس کے ساتھ ہی عظیم نے پوری قوت سے ایک مکہ بخشو کے جبڑے پر دے
را۔ مکہ اس قدر سختی سے پڑا تھا کہ بخشو دور جا گرا۔ جہاں مکہ لگا تھا۔ وہاں گہری
بڑ آئی تھی اور خون بہہ نکلا تھا۔ بخشو اٹھ کر تیزی سے عظیم کی طرف بڑھا۔ لیکن عظیم پر
اس وقت۔ دشمنی، عداوت اور خصومت کا شیطان سوار ہو چکا تھا۔

بخشو اٹھ کر عظیم کی طرف بڑھا اور عظیم کو لات مارنا چاہی۔ پر عظیم نے اس کی
ت ہی پکڑ لی اور دوبارہ ایک گھونسا بخشو کے پیٹ میں مارا۔ پھر جیسے مکوں کا
وفان چل نکلا۔ عظیم دیوانہ وار اس پر ادلوں کے طوفان کی طرح برس پڑا تھا اور
ادم اور تواتر کے ساتھ اس پر مکے برسانے لگا تھا۔ عمارت کے سب لوگ وہاں
ع ہو گئے۔ عظیم نے بخشو کو مار مار کر گرا لیا اور اس پر سوار ہو کر وہ کسی زخمی درندے
طرح دھاڑا۔

بتاؤ تم نے آج تک کتنی لڑکیوں کی عزت لوٹی ہے۔

بخشو خاموش رہا ـــــ عظیم نے ایک اور مکہ اس کے منہ پر دے مارا۔

بتا دو۔ ورنہ جان سے مار دونگا۔

دھیمی آواز میں بخشو نے کہا۔ لوٹی ہے۔

عظیم کا چہرہ خشونت میں شفق ہو گیا۔

کتنی لڑکیوں کی؟

بخشو پھر رک گیا۔

عظیم نے پھر اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ بتاتے ہو یا لگاؤ ایک اور۔ بتاؤ اور اونچی آواز میں بولو تاکہ سب لوگ سن سکیں۔

کافی لڑکیوں کی عزت میں نے لوٹی ہے۔

عظیم نے بخشو کو چھوڑ دیا اور محلے والوں سے مخاطب ہوا۔

لوگو! اس لڑکی نے اپنی عزت بیچی تو تم لوگوں نے اسے دھکے دیکر یہاں سے نکال دیا اور یہ ذلیل کتا جو کئی معصوم لڑکیوں کی عزت لوٹ چکا اسے تم لوگوں نے سینے سے لگا رکھا ہے۔ کیا دونوں ایک جیسے گناہ گار نہیں ہیں۔ جیسا اس لڑکی نے گناہ کیا ایسا ہی اس ذلیل نے بھی کیا۔ اس نے مجبوریوں کے تحت کیا اور اس نے جنسی بھوک کے تحت۔

دونوں ایک جیسے مجرم ہیں۔ پھر لڑکی تمہارے عتاب کا نشانہ کیوں بنی اس لیے کہ وہ عورت تھی، کمزور، ناتواں اور بے سہارا تھی۔ یہی نا ـــــ اسے تم لوگوں نے طوائف اور رنڈی کہہ کر پکارا ہو گا۔ اگر عزت بیچنے سے عورت کا نا

ل جاتا ہے تو مرد جو اس کے ساتھ برابر کا اس گناہ میں شریک ہوتا ہے۔ اسے کیوں کہتے ہو۔ اسے بھی طوائف اور رنڈی جیسا کوئی نام دو۔

اس لڑکی کو ذلیل کر کے یہاں سے کیوں نکالا گیا؟

کیا وہ انسان نہ تھی۔

کیا وہ کسی کی بچی نہ تھی۔

محلے والو! میں تم سے پوچھتا ہوں۔ تم میں کون ایسا ہے جس نے اپنی زندگی کوئی گناہ نہیں کیا۔ اس جگت میں، اس سنسار میں اور اس انام میں سب گناہ گار اور خطا وار ہیں۔ لوگو! کیا تم میں سے کسی کے ہاں جوان لڑکی نہیں؟ سب لوگ خاموشی سے سنتے رہے۔ عظیم کی آواز بلند ہوتی چلی گئی اسے سے نکالتے وقت تم لوگوں نے یہ تو سوچا ہوتا۔ یہاں سے نکل کر وہ کہاں تے گی۔ ہم سب مل کر اس کی مدد کرتے تو یقیناً وہ عزت بیچنا ترک کر دیتی اس سب کچھ چند مجبوریوں کے تحت کیا ہے۔ اسے یہاں سے نکال کر تم لوگوں نے ے مجبور کر دیا ہے کہ وہ گناہوں کے غار میں اور آگے چلی جائے۔

لوگو! سنگدل اور بے رحم لوگو!

تم سب گناہ گار ہو۔

مجرم و خطا وار ہو۔

میں چلا چلا کر کہوں گا۔ تم لوگ ظالم ہو۔ اسے نکالا ہے تو اس بے غیرت کو یہاں سے نکالو۔ تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو اتنی اخلاقی جرأت رکھتا ہو کہ

اسے یہاں سے نکالنے کی آواز بلند کرے۔

کئی جوان ایک ساتھ چلا اُٹھے۔

اسے یہاں سے نکال دو ۔۔۔ یہ اس لڑکی سے بھی زیادہ گناہ گار ہے ۔۔۔ یہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ کئی جوان آگے بڑھے۔ بخشو کو اُٹھا اور دھکے دیکر عمارت سے نکال باہر کیا۔ غلیم واپس مڑا اس نے دیکھا بوڑھا شاموں اپنی بیساکھیوں کے سہارے سر جھکائے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

جب غلیم اس کے قریب گیا تو شاموں نے اپنا سر اُوپر اُٹھاتے ہوئے غلیم سے پوچھا۔

تم نے بخشو سے کہا تھا۔ تم نے کمل کو کیوں نکالا۔ کیا اس لڑکی کا نام کمل ہے

غلیم نے پھٹے پھٹے سے حلقوم میں کہا۔

ہاں بابا!

کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کی تمہیں تلاش تھی۔

وہی ہے بابا!

پھر تم اسے اپنے ہاں کیوں نہ لے آئے۔

غلیم کی گردن جھک گئی۔ بابا! میرے اور اس کے درمیان کچھ فاصلے حائل تھے اور میں انہیں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لڑکی میری زندگی کا محور ہے بابا! میں اسے کراچی سے جانتا ہوں ۔ وہ ایسی نہ تھی۔ حالات نے اسے بگاڑ دیا ہے اور وہ ایسی ہو گئی ہے۔ ان ۔۔۔ ان ظالم مردوں نے اسے اپنا آ

بیچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

شاموں اور غلیم کمرے میں داخل ہوتے ۔ وہاں رفعت کے ساتھ عاصفہ بیٹھی ہوئی تھی۔ غلیم نے کھولتی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے تمہیں منع نہ کیا تھا؟ پھر تم یہاں کیوں آئی ہو؟

عاصفہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ میں آپ کو لینے آئی ہوں۔

دُکھ سے غلیم نے کہا۔

وہ غلیم مر چکا ہے جو کبھی تم سے محبت کرتا تھا۔

جو تمہارا منگیتر و منسوب تھا۔

جو تمہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز جانتا تھا۔

عرصہ ہوا وہ بیچارہ تو مر چکا ہے۔ اب تمہارے سامنے دوسرا غلیم کھڑا ہے۔

اور یہ ۔۔۔ یہ تم سے نفرت کرتا ہے۔

نفرت؟

جس کی کوئی انتہا، قعر اور حد نہیں۔ ایسی نفرت جسے تم پوری زندگی، محبت میں نہ بدل سکو گی۔ جاؤ چلی جاؤ۔ کیا ۔۔۔ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے غلیم کو گھر سے بھاگ کر کراچی دھکے کھانے پر مجبور کیا۔ تم نے میری ماں اور بہنوں کو موت کے منہ میں دھکیلا ۔ تم نے مجھے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا۔ پھر تم اپنے کن احسانات، کی بنیاد پر مجھے لینے آئی ہو؟

عاصفہ آگے بڑھی اور غلیم کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا میں آج آپ

کو لیے بغیر نہ جاؤں گی۔

عظیم نے فوراً اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور لگاتار کئی طمانچے اس نے عاصفہ کے منہ پہ دے مارے۔

ذلیل، کمینی۔ نیچ۔ چلی جا یہاں سے۔ تو اب میرے کام کی نہیں۔

عاصفہ فرش پہ گر کر رونے لگی۔ عظیم وہیں کھڑے کھڑے خلاؤں میں گھورتے ہوتے بڑبڑایا۔

میں اب کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔

مجھے اس کی جستجو ہے۔

میں اسے تلاش کرونگا۔

وہ میری منزل ہے میں اسے بدل کر رہوں گا۔

میں اسے ڈھونڈوں گا۔ وہ ایک نگینہ ہے جسے لوگوں نے عام پتھروں میں تول کر نظر انداز کر دیا ہے۔

میری خاطر وہ اپنے آپ کو ضرور بدلیگی۔

میں جانتا ہوں وہ مجھے چاہتی ہے۔

حالات نے اُسے اس قدر جھکایا ہے کہ وہ مردوں سے نفرت کرنے لگی ہے مگر کب تک؟ ایک روز ——— ایک روز وہ ضرور اپنے آپ کو بدلیگی۔ ایک روز وہ ضرور میرے پاس آئے گی۔ وہ میرا موتی میں اس کی سیپ ہوں۔ میرا اس کا ایسے ہی ساتھ ہے۔ جیسے ستاروں اور کہکشاں کا، سمندر کی

انگڑائیاں لے کر اُٹھتی ہوئی مہیب لہروں کا اپنے مرکز کے ساتھ۔ میری اس کی چاہت ایسے ہی ہے جیسے سیپ اور اُس کے موتی کی۔ جیسے شبنم اور پھول کی میرا اور اس کا ایک تعلق ہے جیسے جسم اور روح کا، کھیت اور کھلیان کا، ناؤ اور پانی کا، چاند اور ستاروں، اور صبح وشام کا۔ اس نے زندگی میں پہلے ہی بہت ٹھوکریں کھائی اب میں اسے اور زیادہ بھٹکنے نہ دونگا میں اسے گلی گلی کوچے کوچے تلاش کرونگا۔

عاصفہ کھڑی ہوگئی۔ اس کے نازک چہرے پر عظیم کی انگلی کے نشان ابھی تک واضح تھے۔ عاصفہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ بس بڑی رحم طلب نگاہوں سے وہ عظیم کی طرف دیکھنے لگی۔ عظیم کا سر جھک گیا اور ہلکے سے اس نے کہا۔ مجھے افسوس ہے آج میرا ہاتھ تم پر اُٹھ گیا ہے۔ میں پہلے ہی گناہ گار ہوں۔ تمہارا روز روز کا یہاں آنا۔ مجھے بدنام کر دے گا۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ میں خود ایک مسافر، ایک بھکاری اور خستہ حال انسان ہوں میں کسی کو کیا دونگا۔ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے اور پھر کبھی ادھر نہ آنا۔ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں اور مجھے اس کی تلاش ہے۔

عاصفہ سر جھکاتے باہر نکل گئی۔ اس کی حالت اس پھول جیسی تھی جو کانٹوں میں اُلجھ کر چھدر چھدر ہو گیا ہو۔



کمل کے پاس صرف ایک اٹیچی تھا جس میں دونوں بہنوں کے کپڑے اور تھوڑا سا اثاثہ تھا۔ سیبل کی اس نے انگلی پکڑ رکھی تھی اور دونوں بہنیں سڑک کے فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھیں۔ پہلے اس نے اپنی اس اینگلو انڈین دلالہ ڈورتھی کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر اس نے اپنا فیصلہ بدل لیا تھا۔

دونوں بہنیں پیدل چل رہی تھیں۔ نارکول کی سڑک ختم ہونے پر نہ آ رہی تھی۔ سورج غروب ہو گیا تھا اور فضاؤں میں لمحہ بہ لمحہ بکھرتی ہوئی تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سامنے ایک چوک آ گیا تھا۔ کمل نے نگاہ اٹھا کر چوک کے پس منظر میں دیکھا۔ ریلوے اسٹیشن آ گیا تھا۔ وہ ویٹنگ روم میں

چلی گئی۔ شاید رات وہیں بسر کرنے کا ارادہ تھا۔

بیچاری کیا کرتی۔ مجبوری تھی۔ اٹیچی کا تکیہ بنا کر اس نے سیبل کو لٹا دیا اور خود اس کے پاس بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کچھ سوچا۔ سیبل کا سر ایک طرف کر کے اس نے اٹیچی کھولا اور کمانی اور ایک بڑا چاقو نکال کر اس نے اپنے لباس کے اندر چھپا لیا۔ باہر آسمان پر بادل گرج رہے تھے۔ اور بجلی کی چمک بار بار روشن لکیریں بنا رہی تھیں۔ سردی کا زور بڑھ گیا تھا۔

رات دس بجے کے قریب جبکہ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ ایک جوان مرد اندر آیا اور بڑی ہمدردی سے پوچھا۔

کس گاڑی کا انتظار کر رہی ہو بہن!

لفظ بہن پر کمل چونکی۔ کیونکہ کسی مرد نے آج تک اسے بہن کہہ کر نہ پکارا تھا۔ تاہم وہ خاموش رہی اور کوئی جواب نہ دیا۔

اس مرد نے پر پوچھا کہاں جاؤ گی بہن!

زخمی آواز میں کمل نے جواب دیا۔

مسافر ہوں۔ یہاں رات بسر کروں گی۔

تمہارا گھر کہاں ہے؟

کمل رو پڑی۔ میرا کوئی گھر اور ٹھکانہ نہیں۔ میں بے آسرا اور بے سہارا ہوں

اس مرد نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے جیسی کئی لڑکیاں ہمارے ملک میں دھکے کھاتی پھرتی ہیں۔ تم اٹھو میرے ساتھ میرے

گھر چلو۔ میری کوئی بہن نہیں۔ سمجھوں گا۔ مجھے دو بہنیں مل گئی ہیں۔

کمل خاموش رہی۔ بچاری کو ٹھکانے کی ضرورت تو تھی ہی۔

وہ پھر بولا۔

ہچکچاؤ نہیں۔ چلو میرے ساتھ۔ میں مقدور بھر تمہاری مدد کرونگا۔

کمل کھڑی ہوگئی۔ اور سیبل کو جگانے لگی۔ اس مرد نے پھر پوچھا۔

یہ بچی تمہاری کیا ہے۔

میری بہن ہے۔

کمل نے اٹیچی اُٹھایا۔ سیبل کی انگلی پکڑی اور اس کے ساتھ ہولی۔ دس منٹ تک وہ چلتے رہے پھر ایک مکان میں داخل ہوئے وہ کوئی ریلوے کوارٹر تھا۔ ایک کمرے میں ان دونوں کو اس نے بٹھایا اور ہمدردی سے پوچھا۔

کھانا کھاؤ گی نا؟

کمل تکلف برت گئی۔ حالانکہ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔

کھانا ہم نے شام کو کھالیا تھا۔ مہربانی۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ کیا تم اکیلے ہی رہتے ہو؟

نہیں میری بیوی بھی میرے ساتھ رہتی ہے۔ وہ ایک روز کے لیے میکے گئی ہوئی ہے۔ تم دونوں بہنیں اٹھو اور ساتھ والے کمرے میں جاکر سو جاؤ۔ کمل اُٹھی۔ اٹیچی لیا۔ سیبل کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں دو چارپائیوں پر بستر لگے تھے۔ پر وہ دونوں بہن ایک ہی بستر میں گھس گئیں۔ سردی سے

ٹھٹھری ہوئی جو تھیں۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد کوئی ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ سیبل گہری نیند سو چکی تھی۔ تاہم کمل جاگ رہی تھی اس نے زمانے کا فراز و نشیب دیکھا تھا اس لیے احتیاط برت رہی تھی۔ کمل نے دیکھا وہی بے غیرت مرد تھا جو اسے بہن بنا کر گھر لایا تھا۔ کمرے میں آکر اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگالی اور کمل کے بستر کی طرف بڑھا۔

کمل اُٹھ کر بیٹھ گئی اور ہمت کر کے پوچھا۔

تم رات کے اس وقت یہاں کیوں آئے ہو اور دروازے کو کنڈی کیوں لگائی ہے۔

اس نے بے غیرتوں کے انداز میں کہا۔

یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟

کمل کھڑی ہو گئی اور زخمی لہجے میں پوچھا

تم نے مجھے بہن کہا تھا؟

اس سے کیا ہوتا ہے۔ مطلب نکالنے کیلئے گدھے کو بھی باپ کہنا پڑتا ہے میں نے تمہیں بہن کہہ دیا تو کوئی پہاڑ تھوڑا ہی گر گیا ہے۔

کیا آجکل کے بھائی اپنی بہنوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں؟

اس سور کی اولاد نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا۔ کیسا بھائی۔ کیسی بہن؟ یہ تو ایک کھیل ہے۔ جس میں میں جیتا اور تم ہار گئی ہو۔

یہ تمہارا وہم ہے۔ ہار جیت کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ میرے نزدیک آئے تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔

وہ کھوستے کا پتر پھر بے شرمی سے ہنسا۔ ایسے موقع پر ہر عورت یہی دھمکی دیتی ہے۔ شور کرنے کی کوشش کی تو گلا گھونٹ کر ابدی نیند سلا دوں گا ــــ وہ آگے بڑھا ــــ

دیکھتا ہوں تم کیسے اپنی حفاظت کرتی ہو؟

کمل نے چاقو نکال کر کھولا۔ رات کے سناٹے اور سردی کی ہولناکی میں کمانی دار چاقو کے کھلنے کی آواز ایک پرخطر تاثر دے گئی تھی۔

آؤ آگے ــ اب ہار جیت کا فیصلہ ہوگا۔

وہ خوفزدہ ہوگیا۔ اور دروازے کی طرف لپکا۔ کمل جب ذرا آگے بڑھی تو وہ زنجیر کھول کر باہر بھاگ گیا۔ کمل نے سیبل کو جگایا۔ اپنا اٹیچی لیا اور وہاں سے نکل کھڑی ہوئی۔

باہر اب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سرما کی تیز اور کاٹ کھانے والی ہوا کے تھپیڑے جسم کو چیتھڑوں کی طرح ادھیڑ رہے تھے۔ دونوں بہنیں بھیگتی ہوئی ایک طرف بڑھتی رہیں۔

بارش اور سردی میں ہر چیز ویران اور سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہ کسی شہر میں نہیں کسی جنگل میں سفر کر رہی ہوں اور ہوا کی آوازیں یوں لگ رہی تھیں جیسے ان کے گرد بھوکی اور خبیث روحیں چیخ چلا رہی ہوں۔ سیبل

نے ٹھٹھری اور کانپتی آواز میں پوچھا۔

ہم اب کہاں جائیں گے باجی؟

کمل رو پڑی اور سیبل کو کوئی جواب نہ دے سکی۔

سیبل نے مغموم آواز میں پوچھا۔

تم روتی کیوں ہو باجی!

کمل بیچاری بھری بیٹھی تھی۔ طوفان کی طرح پھٹ پڑی۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے بے بی! کوئی کسی کا سہارا نہیں۔ ہر کوئی اپنا مطلب نکالتا ہے۔

سیبل نے پھر پوچھا۔

عظیم بھائی جان کے پاس کیوں نہیں چلتی ہو باجی!

کمل اور زیادہ رو دی۔ وہ بھی ہم سے ناراض ہیں بے بی!

سیبل تھوڑی دیر تک خاموشی سے کمل کے ساتھ چلتی رہی۔ اسے سخت سردی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے دانت بجنے لگے تھے۔ مجبوراً اس نے کمل سے کہا۔

کہاں جاؤ گی باجی! مجھے سردی لگ رہی ہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا بھوک بھی لگی ہے۔ کہیں کسی دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔

وہ ابھی تک ریلوے کوارٹرز کے اندر ہی جا رہی تھیں۔ کمل نے شفقت سے سیبل کو چومتے ہوئے کہا۔ تھوڑا سا اور چلو۔ پھر کہیں مناسب جگہ دیکھ کر رکتی ہیں۔ آہستہ آہستہ رات کی گہری گمبھیر تاریکی میں دونوں بے بس و بے آسرا

بہنیں پھر آگے بڑھنے لگیں۔

ایک کوارٹر کے چھجے تلے دونوں بہنیں کھڑی ہوگئیں۔ اس کوارٹر میں بجلی جل رہی تھی اور کوئی بوڑھا مرد اور عورت آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کمل نے ان کی بات چیت سے اندازہ لگالیا تھا کہ ان کے کوارٹر کی چھت ٹپک رہی ہے اور وہ چھت تلے جگہ جگہ برتن رکھ رہے ہیں۔ بلبل نے پھر کہا۔

باجی سردی لگ رہی ہے۔

کمل نے اسے سینے سے لگالیا۔

ٹھہرو میں تمہارے کپڑے بدل دیتی ہوں۔

نیچے جھک کر جونہی کمل اٹیچی کھولنے لگی۔ اس کوارٹر کے دروازے کا پٹ کھلا اور ایک بوڑھے نے باہر جھانکتے ہوئے کمل سے پوچھا۔

تم کون لوگ ہو؟ اور اس سردی اور بارش میں تم دونوں نے کہاں جانا ہے۔

کمل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کھڑی ہوئی اور اس بوڑھے کو دیکھنے لگی۔ بوڑھے نے دیکھا۔ دونوں بہنیں سردی میں کانپ رہی تھیں اس نے دوبارہ بڑی ہمدردی سے کہا ـــــ

اس بارش اور سردی میں کہاں جاؤ گی بیٹی؟

کمل کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور روتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

مسافر ہوں اور منزل سے بے خبر ہوں۔

اس دوران ایک بوڑھی عورت جو شاید اس مرد کی بیوی ہوگی۔ دروازے

کے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ بوڑھے نے پھر بڑی شفقت سے کہا۔

مسافر تو یہ ساری دنیا ہی ہے بیٹی۔ پر تم جاؤ گی کہاں۔

روتے روتے کمل نے کہا۔

مجھے کسی کی تلاش ہے بابا!

بوڑھے نے حیرت کا اظہار کیا۔

تلاش؟ ـــــ اور اس تاریک گہری رات میں۔ کسے تلاش کرتی پھر رہی ہو؟

خدا کو

بوڑھے کا لہجہ متعجب تھا۔ خدا کو؟

ہاں مجھے اس خدا کی تلاش ہے۔ جس نے عورت کو اس قدر ناتواں، کمزور اور مظلوم پیدا کیا ہے۔ میں اس دنیا کے مکینوں سے پوچھتی ہوں۔ خدا کہاں ہے" کہاں ہے وہ خدا جس نے اس ظالم سنسار کو پیدا کر کے چپ سادھ لی ہے۔ پر میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا اور میں تھک چکی ہوں۔

اس بار وہ بوڑھی عورت بولی۔

خدا تو ہر جگہ ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ اس نے تو عورت کے حقوق کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ پر اس دنیا نے ہی عورت کو مظلوم بنا دیا ہے۔

کمل نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ تم بھی ٹھیک کہتی ہو ماں! عورت ازل سے مظلوم اور ابد تک مظلوم ہی رہے گی۔

بڑھیا نے کمل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ماں کہہ رہی ہو تو پھر اندر آ جاؤ۔ باہر کھڑی رو کیوں رہی ہو۔

بوڑھے نے بھی اس کی ہمت بندھائی۔

حالات کی ستائی لگتی ہو۔ اندر آ جاؤ۔ اسے اپنی ماں اور مجھے اپنا باپ اس گھر کو اپنا گھر جانو آ جاؤ اندر۔۔ اندر آ جاؤ بیٹی! یہ میری بیوی سیداں ہے میرا نام سرور ہے۔ میں ریلوے میں قلی ہوں۔ ہماری کوئی اولاد نہیں۔ سمجھونگا د پلی پلائی بیٹیاں مل گئی ہیں۔

دونوں بہنیں اپنا اٹیچی اٹھاتے اندر داخل ہوئیں ۔ سیداں نے پہلے ان کے کپڑے تبدیل کرائے پھر انہیں بستر پر بٹھا کر ایک بھاری رضائی اوڑھا دی سیداں ان کے پاس آئی اور ماں کی سی محبت میں پوچھا۔

تم دونوں نے کھانا بھی نہ کھایا ہوگا۔

سیبل نے بڑی معصومیت سے کمل کی طرف دیکھا۔ کیونکہ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ کمل نے بھی سیبل کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں بہنوں کے درمیان کچھ طے پایا پھر کمل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

سیداں کھڑی ہو گئی۔ میں ابھی کھانا لاتی ہوں۔ سیداں نے فوراً چولہا گرم کر کے کھانا تیار کیا۔ دونوں بہنوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا پھر دونوں میاں بیوی ان کے پاس آ بیٹھے اور سرور نے کمل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

اب کہو بیٹی! اس زمانے میں تم پر کیا گزری؟

چند لمحوں تک کمل سر جھکائے سوچتی رہی۔ پھر شروع سے لیکر اس نے اپنی

کہانی کہہ دی۔ اپنی عزت بیچنے کی تاریک کہانی کو وہ بیچ میں سے نکال گئی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی اس کی کہانی سے سخت متاثر ہوتے تھے۔

بوڑھے سرور نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اصل شیطان بچارہ تو خواہ مخواہ ہی بدنام ہے۔ ہم انسانوں میں اس بھی بڑے بڑے شیطان ہیں۔ وہ تو صرف ایک سجدہ نہ کرنے کا گناہ گار ہے۔ لیکن یہ انسانی روپ والے شیطان ایسے ایسے گناہ کرتے ہیں کہ اصل شیطان بھی کان پکڑتا ہوگا۔

کمل اور سیبل وہاں اپنے آپ کو اب محفوظ تصور کر رہی تھیں۔ سرور اور سیداں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بہنیں گہری اور پرسکون نیند سو رہی تھیں۔



شاہ عالم اور موچی گیٹ کے درمیان عظیم اپنا ٹھیلہ کھینچتا ہوا جا رہا تھا
کے ریڑھے پہ لمبے۔ لمبے لوہے کے سریے لدے ہوتے اور پھر شاہ عالم اور مو
گیٹ کی سڑک ۔ے اندر سفید مسجدوں کے درمیان چڑھائی بھی ہے۔ لہٰذا ا
کا پورا زور لگ رہا تھا اور وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔
ایکدم اس نے اپنا ٹھیلہ روک لیا ایک کار بالکل اس کے سامنے آکر رُ
تھی۔ عظیم اپنا آپ چرانے لگا تھا۔ کار میں سے سعادت اور آسیہ اُترے
اور عظیم کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ عظیم نے اپنی نم آلود پیشانی پونچھ
ہوتے سعادت کو سلام کیا۔ سعادت آگے بڑھے اور اُسے گلے لگاتے
ہوتے کہا۔

بیٹے! مجھے اُمید نہ تھی تم اپنی حالت یہ بنالو گے۔
عظیم کا سر جھک گیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا انکل!
مجھے بتائے اور ملے بغیر ہی میرے بیٹے تم گھر سے بھاگ گئے۔
حالات ہی ایسے تھے۔ میرا وہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔
تمہیں ملنے کئی بار میں اور آسی تمہارے مندر گئے۔ پر تم وہاں ہمیں ملتے ہی نہ
رہے آج اتفاقاً ہی سرِ راہ مل گئے ہو۔ بیٹے! میں نے تو سوچا تھا آسی سے تمہاری
شادی کر دونگا۔ اور تم ایک باعزت اور پرسکون زندگی کی ابتدا کرو گے۔ پر تم نے
مجھے مایوس کیا ہے۔
عظیم نے بڑے دُکھ سے کہا۔
آپ نے میری ماں بہنوں کے بعد جو میرے ساتھ سلوک کیا۔ میں اس کا ممنون
ہوں۔ پر میں نے اس عظیم کا گلا گھونٹ کر اسے ختم کر دیا ہے۔ اور اسی عظیم کی لاش
پر میں نے ایک نئے عظیم کی بنیاد رکھی ہے جسے پرانے حالات کا احساس نہیں اور
جو آسیہ کا منسوب نہیں ہے۔ یا آپ یوں کہہ لیں انکل جب عظیم تھا اس وقت
آسیہ نہ تھی اب جبکہ آسیہ ہے تو عظیم کہیں کھو گیا ہے۔
سعادت نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ تم آسیہ سے ضرور
شادی کرو۔ میں چاہتا ہوں تم آرام و سکون سے رہو۔ اگر آسی سے نہیں تو پھر
عاصفہ سے شادی کر لو۔ اس نے قیصر سے طلاق لے لی ہے۔
عظیم کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اور انتہائی نفرت میں کہا۔ میں اس سے نفرت

کرتا ہوں۔

پھر تم کیا چاہتے ہو۔

میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔ بس دن کاٹ رہا ہوں۔

یہ ٹھیلہ کس کا ہے۔

میرا اپنا ہے۔

اسے کسی کو دیدو اور میرے ساتھ گھر سے چلو

یہ میری آمدنی کا ذریعہ اور سہارا ہے۔ میں اسے کیونکہ کسی دوسرے کے حوالے کر سکتا ہوں۔ اور پھر اس گھر سے میرا کوئی تعلق جس سے میری ماں اور بہنوں کی لاشیں اُٹھ چکی ہے۔

سعادت کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اچھے بیٹے ضد نہیں کرتے۔ اسے دیدو کسی اور کو اور میرے ساتھ چلو۔

نہیں انکل! میں نہیں جاؤنگا۔ میں اس ماحول میں خوش ہوں۔

میری مانوں اور عاصفہ سے شادی کر لو۔

میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔

کون ہے وہ۔ مجھے اس کا پتہ دو۔ میں اس کے والدین سے بات کر کے تمہاری شادی کی بات کرتا ہوں۔ میں صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں بیٹے!

اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ پر کہیں کھو چکی ہے۔ میں اِسے تلاش کر رہا ہوں۔ ایک روز اسے ضرور ڈھونڈھ

ں گا۔

تو پھر میں آسی کی شادی کر دوں؟

ضرور کر دیجئے۔

پاس کھڑی آسیہ اداس ہو گئی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا اور ٹانگیں کپکپا تھیں۔ سعادت نے کچھ روپے نکال کر عظیم کی طرف بڑھاتے یہ رکھ لو بیٹے! تمہارے کام آئیں گے۔

عظیم نے انکار کر دیا۔ میرے پاس ہیں انکل!

تو پھر تم میرے ساتھ نہیں چلتے

جی نہیں

تمہارا آخری فیصلہ ہے۔

جی ہاں۔

پھر مجھے اجازت دو میں چلتا ہوں۔

عظیم آگے بڑھ کر سعادت سے لپٹ گیا۔ دونوں چچا بھتیجا گلے مل لیحدہ ہو گئے۔ سعادت آسیہ کے ساتھ کار میں بیٹھ کر شاہ عالم گیٹ کی طرف گئے تھے۔ اور عظیم اپنا ریڑھ کھینچتا ہوا موچی گیٹ کی طرف چل دیا۔

کمل اور سیبل کو سرور علی کے ہاں رہتے ہوتے کئی ماہ گزر گئے تھے۔ کمل کو دوڑ دھوپ کے بعد ایک ہائی اسکول میں استانی کی جگہ مل گئی تھی۔ اس علاوہ اس اسکول کی استانیوں نے ایک ٹیوشن سنٹر کھول رکھا تھا۔ انہوں نے

کمل کو بھی وہاں رکھ لیا۔ اس طرح وہ پہلے پہر سکول پڑھاتی اور پچھلے پہر ٹیوشن سنٹر چلی جاتی۔

جو کچھ وہ کماتی بوڑھی سیداں کو دے دیتی۔ گردشیں کچھ کچھ تھم گئی تھیں اس کی زندگی میں ایک سکوت سا آ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت مصروف رکھ کر اپنے تاریک اور بھیانک ماضی کو بھلا دینا چاہتی تھی۔ سرور قلی کے ہاں وہ اب آرام جیسی پرسکون زندگی بسر کرنے لگی تھی۔ یہاں رہتے ہوتے۔ اسے عظیم اور زیادہ یاد آنے لگا تھا۔

ایک روز جب وہ کوچنگ سنٹر میں پڑھا کر گھر لوٹ رہی تھی۔ ریلوے کوارٹرز کی حدود میں اس کی مڈبھیڑ بخشو سے ہو گئی۔ اس کے ساتھ وہ بدمعاش بھی تھا جس نے اپنے کوارٹر میں کمل سے زیادتی کرنا چاہی تھی۔ کمل نے نگاہیں بچا کر آگے بڑھنا چاہا مگر بخشو اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور کمل کا بازو پکڑ لیا۔

خوبصورت تتلی! کب تک ہم سے چھپی رہو گی۔

اپنا بازو چھڑا کر خفگی میں کمل نے کہا۔ ہوش میں رہو بخشو!

بخشو کا لہجہ وہی بدمعاشوں والا تھا۔

کون کافر تمہیں دیکھ کر ہوش میں رہ سکتا ہے۔

بخشو نے دوبارہ کمل کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ پر اس سے پہلے ہی کمل نے اس کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ دے مارا۔

ذلیل! بے غیرت۔ شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے۔

بخشو بھی ڈھیٹ ہو گیا تھا۔

شرم کی بھی تم نے خوب کہی۔ جب تمہارا کام ہی عزت بیچنا ہے۔ تو پھر اس کے لیے ہم سے نفرت کیوں۔ جتنا مال مانگو ہم دیں گے۔ بس تم ہمارے ساتھ چلو۔

وہ کمل مر چکی ہے۔ میں یہاں عزت کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ چلو ہماری خاطر ایک بار پھر اپنے پرانے راستوں پر چل دو۔ اور ہماری خاطر تمہیں ایسا کرنا ہو گا۔

کمل آگے بڑھ گئی۔ بھول ہے تمہاری۔

بخشو اس بدمعاش کے ساتھ کمل کے پیچھے چلتا ہوا بولا۔

میں جانتا ہوں تم ان دنوں۔ سرور قلی کے ہاں رہ رہی ہو۔ اب بھی وقت ہے میری بات مان جاؤ۔ اور میرے ساتھ چلو۔ میں نے بھی وہ عمارت چھوڑ دی ہے۔ وہاں سے عظیم نے مجھے تم سے زیادتی کرنے کی وجہ سے ذلیل کر کے نکال دیا تھا۔ میں اب مصری شاہ رہ رہا ہوں وہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں میرے ساتھ چلو۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو یاد رکھو میں ان کوارٹروں کے سب لوگوں کو جمع کر کے تمہارے سیاہ کارناموں اور تمہاری تاریک زندگی سے انہیں آگاہ کر دوں گا۔ پھر دیکھوں گا تم کیسے یہاں رہ سکتی ہو۔

عظیم کا نام سن کر کمل اداس ہو گئی اور اس کی آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں تاہم وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گھر داخل ہو گئی۔ سیبل سیداں کے پاس بیٹھی پڑھ

رہی تھی — وہ ان دونوں کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔ سیداں نے اسے چائے کا گرم گرم کپ لاکر دیا اور وہ پینے لگی۔

اس کا نازک گلابی بدن کانپ رہا تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔

بخشو بدمعاش سے اسے خطرے کی بُو جو آنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ کمل کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ اُٹھ کر صحن میں آ گئی۔ سرور جو صحن میں بیٹھا پودینے کی کیاری سے فالتو جڑی بوٹیاں نکال رہا تھا۔ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ دروازے پر بخشو اور اس کا ساتھی کھڑے تھے۔ سرور نے ان سے پوچھا

کس سے ملیں گے ؟

بخشو بولا — ملنا تو کسی سے نہیں۔

تو پھر کیا بات ہے۔

یہاں تمہارے ہاں کوئی ایسی لڑکی رہتی ہے جس کا نام کمل ہے ؟

رہتی ہے۔ پر تمہارا اس سے تعلق ؟

اسے ہمارے حوالے کر دو۔

سرور گم سم ہو گیا۔

تمہارا اس سے کوئی رشتہ ہے۔؟

اس سے کوئی رشتہ تو نہیں — پر تم اسے یہاں سے نکال دو۔ وہ ایک اوباش اور عزت بیچنے والی لڑکی ہے۔ ان کوارٹروں میں اس کا رہنا مناسب نہیں۔

تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اسے نکال باہر کرو۔

سرور کا لہجہ زہر آلود ہو گیا۔

یہ غلط ہے۔ جھوٹ، بہتان اور اتہام ہے۔ وہ ایک شریف اور معصوم لڑکی ہے۔ وہ حالات کی ستائی ہوئی ہے اور میرے پاس اس نے پناہ لے رکھی ہے۔ وہ اب میری بیٹی ہے اور اس کی حفاظت مجھ پر فرض ہے۔

بخشو اور اس کا ساتھی بدمعاش اونچی اونچی آوازیں شور کرنے لگے۔ وہ لڑکی بے آبرو ہے۔ فحاشہ اور اوباش ہے۔ وہ عزت بیچ کر گزارہ کرتی ہے۔ یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ وہ یہاں نہیں رہے گی۔ نکالو اسے باہر — ہم اسے یہاں نہ رہنے دینگے۔ سب کے گھر جوان بیٹیاں ہیں۔ ان سب کوارٹروں کا ماحول خراب ہو جائیگا۔ اسے یہاں سے نکال دو۔ ورنہ ہم تمہارے خلاف محکمانہ کارروائی کرائیں گے۔

شور سن کر کوارٹروں کے کافی لوگ باہر نکل آتے تھے۔ بخشو نے وہاں جمع ہونے والے لوگوں سے کمل کے متعلق خوب جھوٹی سچی کہیں۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ کوارٹروں کے لوگ بھی ان دونوں کی حمایت میں بول پڑے اور شور کرنے لگے۔

اس گندگی کو نکالو یہاں سے

کوئی کہتا — یہ کوٹھا نہیں ہے۔

کوئی اور فتویٰ دیتا۔ ایسی فحاشہ دوسری بچیوں کو بھی گمراہ کرے گی۔ محلے کے لوگ شور کرنے لگے۔ صحن میں کھڑی کمل کا بدن کانپ رہا تھا اور بیچاری سر جھکائے خاموش کھڑی وہ رو رہی تھی۔

سرور نے ہاتھ لہرا کر لوگوں کو خاموش کرایا اور ان سے کہا۔
بھائیو! میری بات سنو۔ پہلے مجھے لڑکی سے بات کرنے دو۔ ہو سکتا ہے یہ دونوں جھوٹے ہوں اور اسے الزام دے کر بدنام کرنا چاہتے ہوں۔ میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اگر یہ سچ ہوا تو میں وہی کرونگا جو آپ لوگ فیصلہ دینگے۔

ایک معزز آدمی نے کہا۔

ہم یہیں کھڑے ہیں۔ تم اس سے بات کراؤ۔

کمل صحن سے کمرے میں چلی گئی تھی۔ سیداں بیچاری پریشانی کے عالم میں ابھی تک صحن میں کھڑی تھی۔ میبل جو کمل کے پاس کھڑی تھی۔ سخت پریشان اور اداس دکھائی دے رہی تھی۔ وہ عجیب طرح سے بار بار کمل کی طرف دیکھتی تھی جیسے وہ کمل کی حالت پر افسوس کر رہی ہو۔

سرور اندر آیا۔ سیداں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموشی سے روتی ہوئی کمل کو دیکھتا رہا۔ پھر تھکی اور نڈھال سی آواز میں پوچھا۔

کمل!

کمل نے مردہ سی آواز میں کہا۔ جی!

تم نے سنا باہر کھڑے لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔

سب کچھ سن چکی ہوں بابا!

پھر ان کے جواب میں تم کیا کہتی ہو۔ کیا وہ سچ کہتے ہیں۔

کمل تھوڑی دیر تک مہیب سناٹے اور لامحدود خاموشی میں ڈوبی مھوک لیتی رہی اس نے آنکھیں بند کر لی تھی جیسے حالات کا دیا ہوا زہر پی رہی ہو۔ پھر ایداس نے کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔

اور دھکیلے لہجے میں اس نے کہا۔

وہ ٹھیک کہتے ہیں بابا! میں گناہ گار ہوں، فحاشہ اور عزت فروش ہوں۔ ل پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں سب کچھ ہوں بابا۔ مجھ جیسی بے بس لڑکی کو اس ھرتی پر رہنے کا حق ہی نہیں ہے۔

سرور نے شکوہ کیا۔

تم نے اپنے جو حالات مجھے بتاتے تھے ان میں ان باتوں کا ذکر تو نہ تھا۔

کمل نے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

میں نے مصلحتاً ان واقعات کا ذکر نہ کیا تھا۔ میں عزت بیچتی رہی ہوں۔ مگر بوری کے تحت۔ میرا باپ بیمار تھا۔ کوئی کمانے والا نہ تھا۔ کون میرے باپ کا لاج کراتا۔ کون ہمارے گھر کے اخراجات چلاتا۔ میں نے یہ سب کچھ مجبوری کے نحت کیا ہے۔ میں ایک پاکدامن اور باعزت و عصمت لڑکی تھی۔ کچھ لوگوں نے بردستی میری عزت لوٹ لی۔ پھر چند غلط ہاتھوں میں چڑھ گئی اور اس تاریک ور گھناؤنے راستے پر چل پڑی۔

سسک سسک کر روتے ہوئے کمل نے پھر کہا۔

کاش میرا کوئی بھائی ہوتا تو آج مجھے یوں ذلت و رسوائی دیکھنا نصیب نہ

ہوتی۔ میں بھی اس کے ساتھ باعزت زندگی بسر کرتی اور ——— اوا
آوارہ کتوں کی طرح شہر کی گلیوں میں گھومتے بدمعاش سرِعام یوں میری عزت
اچھالتے پھرتے۔

سنبل کھڑی زور زور سے رو رہی تھی۔ سرور کی پلکیں بھیگ گئیں اور بڑ
ہمدردی سے اس نے پوچھا۔

تمہارا کوئی دور و نزدیک کا رشتہ دار نہیں ؟

اس بھری دنیا میں صرف ایک سہارا تھا۔ عظیم اس کا نام ہے۔ وہ میری ا
ہے۔ میرے ابو میری اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ پر وہ بھی اب مجھ سے
ہیں۔ مجھ سے روٹھ گئے ہیں۔ حالات نے مجھے ان کے قابل ہی نہیں رہنے دیا۔
کے علاوہ اس آتش ذہن سنسار میں میرا کوئی بھی نہیں۔

میں تنہا ہوں۔

جنگل میں کھڑے تنہا اور سوکھے درخت کی طرح اکیلی ہوں۔

خدا بھی مجھے بھول گیا ہے۔

تقدیر بھی مجھ سے خفا ہے۔

کمل زور سے پھٹ پڑی۔

میں اکیلی ہوں۔ تنہا اور ایک ہی اکائی ہوں۔ میرا کوئی خدا چھوڑ نا
بھی نہیں ہے بابا!

سرور کھڑا ہو گیا۔ ٹھہرو۔ میں ان لوگوں سے بات کرتا ہوں۔ سرور ج

باہر آیا تو بخشو نے جھٹ پوچھ لیا۔

کیا کہتی ہے ؟

وہ اپنا گناہ تسلیم کرتی ہے۔ اپنی ساری غلطیاں اور کوتاہیاں مانتی ہے۔ میں
نے اس کے حالات سنے ہیں جو کچھ بھی اس نے کیا مجبوری اور بے بسی کے تحت
کیا ہے۔ اِس دنیا میں کوئی اس کا سہارا کوئی نگہبان و آسرا نہیں۔ کچھ ناعاقبت اندیش
انھوں نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ اب وہ سنبھل چکی ہے اور باعزت زندگی
بسر کرنا چاہتی ہے۔

سرور رکا اور کمل کی بھرپور حمایت میں پھر بولا۔

وہ تنہا اور اکیلی ہے۔ میری آپ لوگوں سے التجا ہے اسے میرے پاس
رہنے کی اجازت دے دی جائے اگر ہم نے اسے نکال دیا تو ایک بار پھر وہ
گناہ آلود راستوں پر چلنے کے لیے مجبور ہو جائیگی۔ اب وہ سنبھلی ہوتی ہے اور
عزت زندگی بسر کر رہی ہے — اس وقت اس کی مدد کرنا — ایک ثنائی عمل،
دینی فریضہ اور ایک معاشرتی اصلاحی اقدام ہوگا۔ میں خدا کے نام پر آپ لوگوں
سے التجا کرتا ہوں کہ اسے یہیں رہنے دیں۔

پران بیہودہ دل اور خام ذہن رکھنے والے لوگوں نے سرور کی کوئی التجا نہ
مانی اور شور کرنے لگے۔ اصل میں بخشو اور اس کا ساتھی سارا کام بگاڑ رہے تھے
طرح طرح کی آوازیں سرور کے کانوں میں پڑنے لگیں۔

ہم ایسی لڑکی یہاں نہ رہنے دیں گے۔

تم بھی اس کی آمدنی کھاتے ہو۔
تمہارے کوارٹر کو آگ لگا دیں گے۔
محلے کے ایک بزرگ۔ لوگوں کے ہجوم سے نکلے اور اور سرور سے کہا۔ تم مجھے اس لڑکی کے پاس لے چلو۔ میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔ سرور اسے اندر لیکر آیا۔ کمرے میں اکیلی سیداں ویران ویران کھڑی تھی۔ کمل اور سیبل وہاں نہ تھیں۔
سرور نے سیداں سے پوچھا۔
کمل کہاں گئی۔
سیداں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
وہ پچھلے دروازے سے اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے بہت روکا۔ پر وہ کہتی تھی میں اب یہاں رہنے کے قابل نہیں رہی اور اپنا سامان اٹھا کر وہ چلی گئی ہے۔ سرور اس بزرگ کے ساتھ باہر آیا اور سر جھکا کر مجروح دکھی آواز میں کہا۔ وہ خود یہاں سے چلی گئی ہے۔
لوگ خاموشی سے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بخشو اور اس کا ساتھی بھی تیزی سے ایک طرف لپکے۔ شاید وہ کمل کو ہاتھ سے کھونا نہ چاہتے تھے۔ پر وہ کامیاب نہ ہوتے کمل جانتی تھی وہ اس کا پیچھا کریں گے۔ لہذا وہ انہیں چکمہ دیکر اس طرف سے نکل گئی تھی۔ جہاں کوئی عام راستہ نہ تھا۔
دونوں بہنیں کوارٹروں کو بھول بھلیوں سے نکل کر سڑک کنارے ایک درخت

تلے آ کھڑی ہوئیں۔ سیبل کچھ دیر ٹکر ٹکر کمل کو دیکھتی رہی پھر اس نے بچوں کی سی ضد میں پوچھا۔
اب ہم کہاں جائیں گے باجی!
سیبل کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کمل نے کہا۔
تقدیر ہی ہم سے خفا ہے بے بی!
ہم سے ہی کیوں خفا ہے باجی۔ اور لوگ بھی تو ہیں۔ وہ ہماری طرح کیوں نہیں ہیں۔ کمل رو دی۔ یہ لوگ بڑے ظالم ہیں میری بہن۔
پر ہم اب کہاں جائیں گے۔
اپنے سکول چلتے ہیں بے بی۔ وہاں ہوسٹل میں دونوں بہنیں رہیں گی۔ وہاں اور استانیاں بھی رہتی ہیں۔ جگہ بھی ہے۔ ہم دونوں بہنیں بھی وہاں رہ لیں گی۔ اس طرح یہاں سے روز سکول کو جانا آنا بھی ختم ہو جائے گا۔
ایک اور بات ہے باجی!
کیا؟
ہم عظیم بھائی جان کے پاس کیوں نہ چلی جائیں۔
نہیں بے بی! میں اب اس قابل نہیں کہ عظیم کے پاس جا کر رہوں۔ پھر وہ مجھ سے ناراض اور خفا بھی ہیں۔ سیبل ضد کرنے لگی۔
کیوں اس قابل نہیں ہو باجی! اتنے اچھے بھیا ہیں ہمارے۔ وہ ان لوگوں

کی طرح ہمیں تھوڑا ہی نکال دیں گے، وہ ہمیں ضرور اپنے ساتھ رکھ لیں گے۔

کمل اور زیادہ رو پڑی۔

نہیں بے بی! ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ لوگوں نے پہلے ہی ہمیں اس عمارت سے نکال دیا ہے۔

کیوں نہیں جائیں گے باجی! تم جانتی ہو نا۔ ابو آپ کی شادی عظیم بھائی سے کرنا چاہتے تھے۔ پتہ ہے نا دن میں کئی کئی بار ابو مجھے بھیا کو مندر سے بلانے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ ابو انہیں بیٹا کہتے تھے وہ میرے بھائی ہیں میں ضرور ان کے پاس جاؤں گی۔ چلو نا باجی ان کے پاس تم نے سرلا بابا سے خود کہا تھا کہ صرف عظیم بھائی ہی اس دنیا میں ہمارا واحد سہارا ہیں تم جھوٹ کہتی ہو باجی وہ ہم سے ناراض نہیں ہیں۔ تم چلو ان کے پاس پھر دیکھنا وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔

کمل نے سیبل کو لپٹا لیا اور رونے لگی۔

سیبل پھر بولی۔

میری مانو باجی! چلو عظیم بھائی کے پاس چلتے ہیں۔ یوں ہی ہم دونوں بہنیں دھکے کھاتی پھر رہی ہیں — آپ عظیم بھائی سے شادی کر لینا۔ پھر ہم ان کے پاس رہیں گی۔ وہ مجھے سکول بھی چھوڑ آیا کریں گے باجی! بڑے اچھے بھیا ہیں میرے۔

کمل نے زور سے سیبل کو بھینچ لیا اور روتے روتے کہا۔

نہیں بے بی۔ ہم اسکول جائینگی۔ عظیم اب مجھ سے شادی نہ کرینگے۔ اسی لمحہ ایک خالی رکشہ وہاں سے گزرا۔ کمل نے اسے روکا اور دونوں بہنیں سکول روانہ ہوگئیں۔



اس روز جمعہ تھا۔ غلیم نہا کر اپنے ٹھیلے کے پہیوں پر پانی ڈال رہا تھا۔
مندر کے اندر شاموں، آفتاب اور رفعت بیٹھے تھے۔ رفعت ناشتہ تیار کر چکی
تھی۔ پھر شاید سوچی سمجھی سکیم کے تحت ایک عمل شروع ہوا۔ رفعت نے قرآن پاک
کھولا۔ اور پڑھنا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ وہ ترجمہ بھی پڑھتی جاتی تھی۔
غلیم جو ٹھیلے کے پہیوں پر پانی ڈال رہا تھا اس کے کانوں میں رفعت کی گونج
ہوئی آواز رس گھولتی چلی گئی۔
وہ (خدا) بڑا عالی شان ہے جس کے قبضہ میں تمام سلطنت ہے اور و
ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے
کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ ہے اور وہ زبردست بخشنے والا ہے جس نے او

تلے سات آسمان پیدا کیے تو اس صفت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا۔
غلیم گو پہیوں پہ پانی ڈال رہا تھا۔ مگر ان الفاظ کا سحر اسے وہاں روکے ہوئے
تھے اور وہ بڑی توجہ اور غور سے سن رہا تھا۔ رفعت کی آواز پھر گونجی تھی۔
تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے۔ کہیں تمہیں خلل نظر آتا ہے؟ بلا تامل تو نے کبھی
ار دیکھا۔ اب کی بار تامل سے پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ۔ نگاہ ذلیل و درماندہ
ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی۔
غلیم سوچوں میں کھو گیا تھا لیکن جلد ہی رفعت کی طرف سے ایسے الفاظ
در کے روشن دھارے کی مانند آئے اور اس کی سماعت سے گزرتے چلے گئے
"اور جو لوگ اپنے رب کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے لیے دوزخ کا عذاب
ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ جب وہ لوگ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس کی بڑی
در کی آوازیں سنیں گے۔ اور وہ اس طرح جوش مارتی ہو گی جیسے معلوم ہوتا ہے
ھٹ پڑے گی۔
اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لیے زمین پیدا کی سو تم اس کے راستوں پر
و اور خدا کی روزی سے کھاؤ۔ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔
یا تم لوگ اس سے غافل ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے اور وہ تم کو زمین میں دھنسا
ے تو زمین بھی تھرتھرانے لگے یا تم لوگ اس سے بےخبر ہو گئے ہو جو آسمان میں
ہے اور وہ تم پر تند ہوا بھیج دے۔ تو عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ میرا ڈرانا
سا تھا۔

علیم کا ذہن کہیں ڈوب کر ایک گہرے غوطے کے بعد ابھرا اور الفاظ پھر
اس کے کانوں میں نور اور روشنی کی لہریں بن کر اتر گئے۔
اور آپ کہہ دیجئے۔ اچھا بتاؤ پانی (جو کنوؤں میں ہے) نیچے اتر کر غائب ہو
جائے سو وہ کون ہے جو تمہارے لیے کنویں کی سوت کو جاری کر دے۔

رفعت نے قرآن پاک بند کیا اور علیم کو آواز دی۔

بھائی جان! ناشتہ کر لیں۔

علیم سنبھلا۔ ناشتہ کر کے جب وہ اپنا ٹھیلہ کھینچنے لگا تو رفعت بھاگتی ہوئی
نکلی اور بڑے پیار سے کہا۔

آج دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھانا بھیا!

علیم نے تعجب سے پوچھا۔

کوئی خاص بات ہے؟

نہیں بھیا۔ بس تم دوپہر کو گھر آ کر کھانا کھانا۔ آؤ گے نا بھیا تم کہتی ہو تو آجاؤں گا
ضرور آنا بھیا۔ نہیں تو میں خود آپ کو لینے منڈی آجاؤں گی۔ علیم نے اس کے سر
پر دھپ لگائی۔ میں آجاؤں گا۔ تم منڈی نہ آنا۔ علیم ٹھیلہ کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔
جب وہ سکول کے پاس سے گزر رہا تھا تو بچے وہی دعا پڑھ رہے تھے۔

گلشن میں تیرا جلوہ دیکھا
پھولوں کی ادا بلبل کی صدا

دیتی ہے پتہ یہ باد صبا تو باغ جہاں کا مالی اسے خالق کون و مکاں علیم کو

کر دُعا سننے لگا۔ آج اس نے خفگی اور ناراضگی کا اظہار نہ کیا تھا۔

دوپہر تک وہ اپنی مزدوری کرتا رہا۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب وہ مندر
یا۔ نہا کر اس نے کھانا کھایا اور جب وہ جانے لگا تو رفعت نے اسے روکتے
ئے کہا—

ٹھہر کر جانا بھیا۔ تھوڑی دیر آرام کر لو۔ رفعت نے ایک چارپائی اندر سے نکال
ملتاس تلے لگا دی۔ ذرا آرام کر لو۔ علیم چپ چاپ کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گیا۔
ب کچھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا۔ کیونکہ شامو نے محلے
سجد کے خطیب سے بات کر رکھی تھی اور آج جمعہ کے روز انہوں نے علیم کو متعلق
نا تھا—

علیم کو لیٹے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مسجد کا لاؤڈ سپیکر کھٹکا۔ پھر خطیب نے
ت کی جس آیت کی تلاوت کی گئی تھی وہ بھی خدا پر یقین رکھنے کے متعلق تھی۔ اس
ت رفعت کمرے سے نکلی اور علیم کو پکارا۔

بھیا! سو گئے ہو؟

علیم نے سر اوپر اٹھا کر کہا۔

نہیں تو۔ میں جاگ رہا ہوں۔

رفعت مطمئن ہو کر اندر چلی گئی۔ خطیب تھوڑی دیر تک دھیمے دھیمے لہجے
اس آیت کا ترجمہ پھر تشریح کرتے رہے۔ پھر گویا وہ آتش دہن ہو کر جوش و
ل میں بول اٹھے تھے۔

کارل مارکس کے جانشینو !

ڈارون کے پیروکارو !

ظلمت کے فرزندو !

شیطان نما انسانو !

ملحدو ! فاسقو ! دہریو ! خدا کے منکرو ! ۔ خدا ہے اور وہ قائم بالذات ہے جبکہ انسان اس کے سامنے مجبور محض اور قائم بالغیر ہے۔ اگر ـــ اگر خدا نہیں ہے تو یہ تاریک و سرد فضائیں، بارش و آندھی یہ خوشبو و رنگ، طلوع و غروب، شام و سحر، یہ صحرا و بیابان، پہاڑ جنگل اور غراتے ہوتے نیلے سمندر۔ یہ عروج ما اور زوال شب، یہ بادل و گھٹائیں کون سی ہستی ہے جو ان سب کا انتظام و انصرام سنبھالے ہوتے ہے۔

کس کے حکم سے ؟ کس ذات کے کہنے پر سورج کبھی خط استوار اور کبھی جدی و سرطان پر چمکتا ہے ؟ وہ کون ہے جس نے سورج کی قرمزی شعاعوں کو توانائی بخشی۔ کس کے ایما پر چاند اپنی ماہانہ منزلیں بغیر رُکے اور دم لیے طے کرتا رہتا ہے۔ کون سی ہستی ہے وہ جس نے نیلے سمندروں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ طوفان و با کو کون کنٹرول کرتا ہے۔

اے کافرو! خبیث روحو! سیب کو اس کی سرخی اور انگور کو اس کی شیرینی رنگت دینے والا کون ہے۔ کس نے آدم کے بت میں روح پھونکی۔ کس کے کہنے پر نوح نے کشتی تعمیر کی۔ کیوں زرتشت نے یزدان اور اہرمن قوتوں کا سبق د

کس روشنی اور کس نروان کی تلاش میں مہاتما بدھ نے برسوں کا بن باس کاٹا۔ کوہ طور پر کون موسیٰ سے ہم کلام ہوا۔ داؤد نے کس کی ثنا کے گیت اور حمد کے نغمے الاپے۔ ایوب کے قدموں میں کس نے میٹھا و شفاف زمزم جاری کیا۔ یونس کو مچھلی کے پیٹ سے کس نے نکالا۔ کون ذات ہے وہ جس نے موسیٰ اور ہارون سے فرعون جیسے سرکش حکران کو رسوا و ذلیل کیا۔ کس کی ہستی ہے وہ جس نے نمرود کی آگ کو ابراہیم پر ٹھنڈا کیا۔ کسی کی خوشنودی میں ذکریا نے آرے میں چر جانا قبول کیا۔ کس کی رضامندی کے ساتھ عیسیٰ مردوں کو زندہ کرتے رہے۔ کس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر محمدؐ عربی نے طائف میں اپنا بدن لہولہان کرایا۔ کس کی راہ میں وہ تین سو تیرہ اور بے سروسامان ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں قریش سے نبرد آزما ہو گئے تھے ـــ

آخر دنیا کے اتنے پیغمبر اور رشیوں نے جنہیں دنیا کے اکثر مذاہب مانتے ہیں۔ کیونکہ خدا کی وحدانیت اور الوہیت کے گیت گاتے کیوں انہوں نے خدا کو ماننے اور اس کے وجود کو تسلیم کرنے کی تعلیم دی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کر کے ایسا کیا تھا۔ جبکہ ان کے درمیان سینکڑوں اور ہزاروں برسوں کا فاصلہ، دُوری، بعد اور تفاوت ہے۔

میرے بھائیوں ! خدا ہے۔ اس کی تکوینی قوت سے یہ دنیا پیدا ہوئی وہ نور کا ایک دھارا ہے جو ازل سے ابد تک بہتا رہے گا۔ اس کی ازلی اور وہبی قوتوں کے سبب انسان اس دنیا میں جہد و عمل کا کھیل کھیل رہا ہے۔

وہ لاہوت کا منبع ہے اور اس کی موجودگی کا جمال لایزال ہے ۔ وہ وہی ہے
جس نے نار جہنم، رات کی وسعت اور سمندروں کا مدوجذر جاری کیا؛
خدا کے منکرو!! اپنے دل میں خشیت ایزدی کو جگہ دو ۔ اور اپنے مالک و
خالق کے سامنے اپنی شہریت کا حق ادا کرو ۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے ۔ وہ لاریب
ہے اس کی ذات پر ایمان لاؤ ۔ ڈرو اس وقت سے جب وہ محشر برپا کرے گا
اور ہر انسان سے اس کا حساب لیکر گناہوں کی سزا اور نیک اعمال کی جزا دیگا ۔
فاسق و فاجر لوگو! اس دور میں بھی جبکہ سائنس و حکمت اپنے ارتقاء کی
انتہائی منزلیں طے کر چکی ہے ۔ کوئی بھی مشینیں، کوئی آلہ، کوئی چیز ایسی نہیں جس
کا کوئی انجینئر اور بنانے والا نہ ہو ۔ پھر یہ کیسے ممکن کہ یہ کائنات جو اس قدر وسیع و
عریض آسمان و زمین پر مشتمل ہے اس کا پیدا کرنے والا کوئی نہ ہو ۔ ضرور رہے اپنے
اردگرد کا معائنہ کرو ۔ کائنات کے ہر ذرے میں ۔ اشجار کے ہر پتے میں تمہیں خدا
کی تکوینی قوت نظر آئے گی ۔

دہریت کے علمبردارو! ہر دور میں، ہر قوم نے ہر قبیلے نے خدا
کی ہستی کو کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کیا ہے ۔ قدیم آسٹریلینوں نے
اسے بادلوں کا باپ کہہ کر پکارا ۔ مشرقی قوموں نے اسے ایک بڑا اژدہا
کہا ۔ نیوزی لینڈ کے قدیم مورس قبائل نے اس ماورائی ہستی کو اتوا
کہہ کر یاد کیا ۔ نیوگنی اور جزائر سلیمان کے لوگوں نے اسے مانا کا
نام دیا ۔ پولینیشیا کے رہنے والوں نے تاروا اور افریقہ کے وحشی قبائل

نے خدا کو انگائی کہہ کر پکارا ۔
قدیم مشرقی قوموں نے اسے اداماکرو ۔ قدیم امریکیوں نے اسے
نونکا اور لنکا کے لوگوں نے اسے مخالف روح کے نام دیئے ۔ موہنجوڈارو
کے باسیوں نے اس عظیم ہستی کو اودن، گونڈ قبائل نے بھگوان اور قدیم
سامیوں نے اسے ایل کے نام دیئے ۔ یہی ایل آگے چل کر الٰہی بن گیا ۔
آریوں نے اسے برما ۔ ایرانیوں نے آہوفردا، مصریوں نے آمن
اور قدیم یونانیوں نے اسے عقل اول کہہ کر اس کی عبادت کی اور اسے
مدد کے لیے پکارا ۔

رفعت نے باہر آکر دیکھا ۔ عظیم کا جسم کپکپا رہا تھا اور وہ کچھ بدلا بدلا سا لگ
رہا تھا ۔ وہ اٹھا اور اپنا ٹھیلہ کھینچتا ہوا باہر نکل گیا ۔ رفعت خاموشی سے
اسے دیکھتی رہی ۔ عظیم جب باہر نکل گیا ۔ تو رفعت چونکی ۔ مسجد میں خطیب کی تقریر
ابھی جاری تھی اور وہ اس کے خاتمے تک عظیم کو وہاں روکنا چاہتی تھی ۔ وہ چلاتی
ہوئی عظیم کے پیچھے بھاگی ۔
بھیا! بھیا!
لیکن عظیم تو اس دڑبہ نما عمارت کے احاطے سے سڑک پر چڑھ چکا تھا ۔ رفعت
اسے پکارتی اور بھاگتی ہوئی باہر نکلی ۔ اس کا دھیان دور سڑک کنارے جاتے
ہوئے عظیم کی طرف تھا ۔ بے خیالی میں یکبارگی ہی وہ ایک تیز رفتار گاڑی سے ٹکرائی
اس کا جسم رندھ گیا اور بیچاری چور چور ہوگئی ۔

گاڑی کی دلخراش بریکوں کی آواز پر شامو اور آفتاب مندر سے نکل کر سڑک پر آئے تھے۔ رفعت سڑک پر خون میں لت پت تڑپ رہی تھی۔ شاموں اور آفتاب اسے سنبھالنے لگے اور روتے بھی جارہے تھے۔

عظیم نے بھی حادثہ دیکھ لیا تھا۔ اپنا ٹھیلہ وہیں چھوڑ کر وہ بھاگا۔ رفعت کو اپنی گود میں سمیٹتے ہوتے اس نے ہچکیاں لیکر روتے ہوتے آفتاب سے کہا۔

آفتاب! تم کسی خالی رکشے کو روکو اسے ہسپتال لے چلیں ——— جلدی کرو۔

آفتاب سڑک کنارے کھڑے ہو کر تیزی سے گزرتے ہوتے رکشے دیکھنے لگا ——— رفعت کی حالت یوں لگ رہی تھی جیسے وہ لمحہ بہ لمحہ ڈوبتی جارہی ہو۔ اپنا خون آلود ہاتھ رفعت نے عظیم کے چہرے پر بڑے پیار سے پھیرتے ہوئے کہا۔

بھیا! زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں مر رہی ہوں بھیا۔ کیا خدا کے علاوہ کوئی ایسی ہستی ہے جو مجھے موت سے بچالے۔

عظیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ جھک کر رفعت کی خون آلود پیشانی اس نے چوم لی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

ٹوٹتی آواز میں رفعت پھر بولی۔

بھیا! کیا تم اب بھی نہیں مانتے کہ خدا ہے؟

عظیم نے رفعت کو لپٹا لیا اور روتے روتے کہا۔

خدا ہے میری بہن۔ میں کمینہ ہی بھٹک گیا تھا۔

رفعت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ موت میں ڈوبتی ہوئی مسکراہٹ میں ہلکے سے اس نے کہا۔

اگر میرے مرنے سے آپ خدا کو ماننے لگے ہیں بھیا! تو قسم خدا پاک کی میرے لیے یہ سودا مہنگا نہیں۔ رفعت نے بھی عظیم سے لپٹ جانا چاہا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اس کے جسم نے ایک پھریری سی لی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔ عظیم اس کی لاش مندر لے آیا۔ اور تینوں اس کی لاش سے لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے تھے۔

رفعت کی موت کے ایک ہفتہ بعد تک عظیم نے ٹھیلہ نہ نکالا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے رفعت کی موت نے اسے توڑ دیا ہو۔ بجھ سا گیا تھا بچارہ رفعت اس کی بہن جو تھی۔

آٹھویں روز اس نے جاکر کہیں ٹھیلا نکالا۔ بچارہ دن بھر مزدوری کرتا رہا۔ شام کے وقت جبکہ فضاؤں میں اندھیرا، دھند اور دھوئیں کی چادر پھیلنے لگی تھی۔ وہ کسی کا سامان چھوڑ کر مسجد وزیر علی کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ایک دم مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر مغرب کی اذان سنائی دی۔ عظیم رک گیا اور بڑے غور سے اذان سننے لگا۔ مؤذن جب رک گیا تو عظیم نے ٹھیلا سڑک کنارے کھڑا کر دیا اور مسجد کی طرف بھاگا۔ مسجد کی چوکھٹ پکڑ کر اس کے ساتھ زور زور سے اپنا سر ٹکراتے ہوتے وہ چلا اٹھا۔

میرے خدا! میرے خالق و مالک! میں بھٹک گیا تھا ——— مجھے معاف کر دے

میرے اللہ - میں توبہ کرتا ہوں میرے اللہ میں توبہ کرتا ہوں - میرے خدا دنیا کے
غموں اور دکھوں میں میں بندہ نابکار اور رسوا اور روسیاہ تجھے فراموش کر گیا
تھا - تو ہر جگہ اور لاشریک ہے میرے خدا! جوتے اتار کر عظیم مسجد میں داخل ہوا
اور بلند آواز میں سبحان ربی الاعلیٰ پکارتا ہوا وہ اس طرف بڑھا جہاں لوگ بیٹھے
وضو کر رہے تھے -



کمل اور سیبل دونوں بہنوں کی زندگی ایک بار پھر پرسکون ہو گئی تھی - پر شاید
ابھی تک تقدیر ان سے خفا اور آسودگی نالاں تھی - کمل اسکول میں جم گئی تھی - دونوں بہنوں
کو رہنے کے لیے ہوسٹل میں کمرہ بھی مل گیا تھا ——— پر ان ویرانہ پسند اور
مجرم خصلت لوگوں کے ترکش میں ابھی تک ان پر چلانے کے لیے تیر باقی تھے -
اسکول کی ایک لڑکی کی سالگرہ تھی جس میں دوسری اُستانیوں کے علاوہ
کمل بھی مدعو تھی - سالگرہ کی تقریب کے بعد کمل دوسری اُستانیوں کے ساتھ جب
اس لڑکی کی کوٹھی سے نکلنے لگی تو ایکطرف سے اچانک ایک جوان آیا اور کمل کا راستہ
روکتے ہوئے پوچھا -

کمل! تم یہاں ؟

کمل بوکھلا گئی اور بغلیں جھانکنے لگی تھی۔ وہ جوان اس کے پرانے گاہکوں
میں سے تھا اور جو کمل کو ساتھ لیجانے کے لیے بڑی بیتابی سے اس کا انتظار
کیا کرتا تھا۔ شاید وہ کمل کو پسند کرتا تھا اس کا نام جہانگیر تھا جس لڑکی کی سالگرہ
تھی اس نے فوراً اس جوان سے پوچھ لیا۔

بھیا آپ انہیں جانتے ہیں؟ وہ اس لڑکی کا بھائی تھا۔

وہ اور کمل اٹھا۔ جانا کیوں نہیں۔ یہ میرے دوست کی بہن ہے۔
اس نے فوراً کمل کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔

آؤ تمہیں امی سے ملاؤں۔ وہ روز تمہیں یاد کرتی ہیں۔ کمل بچاری مجبور ہو گئی
تھی۔ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اسے کھینچتا ہوا اپنی ماں کے پاس لے گیا۔

امی! یہ ہے وہ کمل جس کی مجھے تلاش تھی۔

اس کی ماں کے چہرے پر بشاشت بکھر گئی۔ اور کمل کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے
ہوتے اس نے کہا ـــ بیٹھو بیٹی! جہانگیر تو تمہیں تلاش کرتے کرتے تھک گیا
ہے۔ میں جب بھی اس سے اس کی شادی کی بات کرتی تھی۔ تو کہتا تھا اگر شادی
کرتی ہے تو کمل سے ورنہ نہیں میرے خیال میں تم دونوں ایکدوسرے سے محبت
کرتے ہو۔ جہانگیر کہہ رہا تھا تم نے اپنی پہلی رہائش تبدیل کر لی ہے۔ تم شاید لیے بی
کے سکول میں استانی ہو۔

بڑی مشکل سے مردہ آواز میں کمل کہہ سکی۔

جی ہاں!

وہ اٹھ کھڑی ہوتی۔ تم دونوں اپنی شادی کے متعلق خود ہی طے کر تو تم دونوں
مل کر جو فیصلہ کرو گے مجھے منظور ہو گا۔ ایک بات کا خیال رکھنا بیٹی یہ میرا اکیلا ہی
اکیلا بیٹا ہے۔ اس کا دل نہ توڑنا۔ شادی کے لیے تمہاری جو بھی شرائط ہوں گی۔
ہمیں منظور ہیں۔ میں جہانگیر کے ابا کو اطلاع کرتی ہوں۔ وہ باہر نکل گئی۔

کمل تیزی سے اٹھی اور تیر کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ جہانگیر نے اسے
روکنے کی کوشش کی لیکن کمل نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور کوٹھی سے باہر
نکل گئی۔ جب وہ ہوسٹل آئی تو دوسری استانیاں اس کے متعلق کھسر پھسر اور
چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ اس سے کسی نے پوچھا تو کچھ نہ بریوں لگتا تھا انہیں کسی
بات کی جستجو ضرور ہے۔

شام کے وقت جبکہ لیے بی ہوسٹل کے لان میں سکول کی دوسری بچیوں کے
ساتھ پڑھ رہی تھی اور کمل اپنے کمرے میں کورس کی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی
جہانگیر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ آتے ہی کمل کے ساتھ بستر پر بیٹھ گیا اور سلام
کہتے ہوتے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

کمل نے فوراً اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تڑپ کر وہ اٹھی اور بیڈ کے سامنے
کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے وہ کوئی بہت بڑا طوفان کھڑا کر
دیگی۔ جہانگیر کمل کی اس حرکت پر ہنس دیا۔

ایسی بھی کیا بے رخی ہوتی؟
کمل نے غصے میں کہا۔

تم یہاں کیوں آتے ہو؟

تمہیں دیکھنے۔

یہاں سے چلے جاؤ۔

جہانگیر نے بڑی بے بسی سے کہا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ وقت یاد نہیں
جب تم دن دن بھر میرے ساتھ رہا کرتی تھی۔

کمل پیلی ہو گئی۔ وہ کمل مر گئی ہے جو مجبوریوں تلے دبی ہوتی تھی۔

میں اس کمل سے محبت کرتا ہوں۔ اور مجھے اس کی تلاش ہے۔

جاؤ ڈھونڈتے پھرو اسے

وہ تو میرے سامنے ہے اور میں اسے لینے آیا ہوں۔

کمل اور زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔

میں کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ صرف ایک شخص کے علاوہ میں دنیا کے
سب مردوں سے نفرت کرتی ہوں۔

جہانگیر کی ہمت بندھی۔ کون ہے وہ؟

وہ ایسی ہستی ہے۔ جسے میں دل کی گہرائیوں سے پیار کرتی ہوں۔ وہ میرے
جیون کے آسمان پر ایک روشن ستارہ ہیں۔

کیا نام ہے اس کا؟

ان کا نام عظیم ہے۔ وہ میرے جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ میں نے مجبوریوں
کے تحت عزت بیچی تھی۔ اس وقت وہ ذہنی شکستگی میں مبتلا تھے اور میری

ی مدد نہ کر سکتے تھے بلکہ انہیں میری محبت کی ضرورت تھی۔ میں اب بھی ان سے
م کرتی ہوں۔ پر عزت بیچ چکنے کے بعد میں اپنے آپ کو اس قدر ہلکا اور نیچ
ھتی ہوں کہ ان کے قابل نہیں رہی۔

جہانگیر بجھ گیا۔ وہ کہاں رہتا ہے؟

یہیں اسی شہر میں۔

کیا کرتا ہے؟

معمولی مزدور ہے۔

جہانگیر سختی پر اُتر آیا۔

تم اس سے محبت نہیں کر سکتی ہو۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہو گا۔ میں
یں پیار کرتا ہوں۔ میں تم سے شادی کر کے تمہیں پرسکون زندگی بسر کرنے
ے قابل بنانا چاہتا ہوں۔

کسی کے جذبات پر پہرہ نہیں بٹھایا جا سکتا تھا۔ میں تمہاری یہ پیش کش
ارت سے ٹھکراتی ہوں۔

جہانگیر اور بڑھ گیا۔ اپنی جگہ سے اُٹھا اور کمل کا بازو پکڑتے ہوئے کہا،
ٹھو! چلو میرے ساتھ!

پوری قوت کے ساتھ کمل نے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔ اپنی حد
ں رہو۔ کس بنا پر تم مجھے بار بار ہاتھ لگا رہے ہو۔

جہانگیر طیش میں آ گیا۔ تمہیں یہ طمانچہ مہنگا پڑے گا۔

تیز چتونوں سے گھورتے ہوئے کمل نے کہا۔

تو کیا اس دنیا میں صرف عورت کی عزت ہی سستی رہ گئی ہے۔ جہانگیر نے
دھمکی دی۔ اب بھی وقت ہے۔ میرے ساتھ چلو۔ ورنہ یہاں تمہارا رہنا میں دوبھر
کر دوں گا۔

یہ زمین بہت وسیع ہے۔

پر تمہارے لیے تنگ ہو جائے گی۔

میں نے زندگی کا ایک تلخ دور دیکھا ہے۔ مجھ پر ایسی باتوں کا اب کوئی اثر
نہیں۔ دوبارہ اگر میرے کمرے میں آئے تو مجھ اور تم دونوں میں سے پھر ایک ہی
زندہ رہے گا۔

جہانگیر سور کی طرح نتھنے پھڑپھڑاتا باہر نکل گیا۔ میں دیکھونگا تمہیں؟

کمل دوسرے روز جب اسکول گئی۔ تو ہیڈ مسٹریس نے اسے اپنے کمرے
میں بلایا۔ کمل کو کچھ فکر دامنگیر ہوئی۔ تاہم وہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی اندر
جا کر ہیڈ مسٹریس کے سامنے بیٹھ گئی اور ہلکے سے پوچھا۔

مجھے آپ نے بلایا ہے؟

ہیڈ مسٹریس نے غور سے اسے دیکھا۔

ہاں۔ تمہارا گھر کہاں ہے کمل؟

کمل ماند پڑ گئی۔ گھر تو میرا کہیں بھی نہیں۔ مہاجر ہیں۔ یہاں آکر مکان نصیب
نہیں ہوا۔ اب تک کرائے کے مکانوں میں ہی رہتے آئے ہیں۔

تمہارے ماں باپ؟

مر چکے ہیں؟

کوئی اور رشتہ دار

کمل کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ کوئی نہیں ہے۔

عظیم کون ہے؟

وہ میرے محسن ہیں۔

کیا اسکول کی زندگی سے پہلے تم عزت بیچتی رہی ہو؟

کمل کا سر جھک گیا۔ بیچاری الجھ گئی تھی۔

جھوٹ نہ کہنا۔

کمل نے اپنا سر اوپر اٹھا کر سرد مردہ آواز میں کہا۔

جی ہاں ـــ پر ـــ اس کی آواز حلق میں ڈوب گئی تھی۔

تو کیا تمہارے خیال میں ایک ایسی لڑکی جو خود اپنے ہاتھوں اپنے جسم کا
ا کرتی رہی ہو۔ اسکول کی بچیوں کو رہبری کا سامان مہیا کر سکتی ہے؟

کمل نے سماجت کی۔

یہ سب کچھ مجبوریوں کے تحت ہوا تھا۔ میرے ساتھ میری کمسن بہن اور
باپ نہ ہوتے تو میں عزت بیچنے پر موت کو ترجیح دیتی۔

پر میں نے تو اسکول کے ماحول کو دیکھنا ہے۔ اسکول کی ایک لڑکی کے

بھائی نے مجھے تمہارے متعلق یہ اطلاعات دی ہیں۔ اس نے اپنا نام جہانگیر
بتایا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر تمہیں یہاں سے نہ نکالا تو وہ اسکول کو بند
کرنے کی مہم چلائے گا۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں۔ مجبوراً مجھے تمہاری
ختم کرنا پڑی ہے۔

کمل نے روتے ہوئے کہا۔

تو کیا دنیا کے ادیان، کائنات کے اخلاقی ضابطے اور انسانیت کی روایات
یہی کہتی ہیں کہ راستہ بھٹکا ہوا ایک انسان اگر اندھیرے سے نکل کر روشنی
آجائے۔ گناہوں کی دہلیز پار کر کے سنبھل جائے تو اسے پھر تاریکی اور گمراہی
طرف دھکیل دیا جائے تاکہ اس کی ہستی ہی مٹ جائے اور انجام کار انسان
نہ کہلا سکے۔

ہیڈ مسٹریس نے بیزاری سے کہا —— یہ سب کتابی جملے ہیں۔

کمل نے غصیلی آواز میں کہا۔

کتابی جملے نہیں — ایک بے بس اور مجبور عورت کی روداد ہے۔ اگر
عورت ہی حالات کی ستائی ہوئی عورت کی مدد نہ کرے گی تو مرد تو کتوں
طرح اس کا بدن ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔

میں مجبور ہوں تم اس اسکول نہیں پڑھا سکتی ہو۔

آپ کا آخری فیصلہ ہے ؟

بالکل! اب تم جا سکتی ہو۔

کمل باہر نکل گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ سر سے ڈوپٹہ ڈھلک کر شانوں
پر گر گیا تھا۔ وہ سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ استانیاں کلاسیں چھوڑ کر برآمدے
میں کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ ان کے پاس سے گزرتی ہوئی کمل
سٹاف روم میں آئی اور ایک کرسی پر گرتے ہوئے اس نے اپنا سر میز پر
پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ایک ساتھی ٹیچر سٹاف روم میں آئی اور اس
کا شانہ ہلاتے ہوئے بلایا۔

کمل! کمل!

کمل نے چہرہ اوپر اٹھا۔ وہ رو رہی تھی۔ شاید ماتم کر رہی تھی۔ حالات کی
تلخیوں اور بے رحم زمانے کے ناروا سلوک کا۔

کیا کہتی ہے ہیڈ مسٹریس ؟

سروس سے نکال دیا ہے۔

کیوں ؟

بس اس دور میں ہر کوئی مجبور کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ کمل کھڑی
ہو گئی اور اپنی ساتھی ٹیچر سے کہا۔

تم ایک بھلائی کرو گی سائرہ

کہو ؟

میں یہاں سے ابھی جا رہی ہوں۔ سبیل یہیں رہے گی۔ میری تم سے التجا ہے
کہ تم اسے اپنے ساتھ رکھ لینا اور میرے بعد اس کا خیال بھی رکھنا۔

اس کی ساتھی پگھل گئی۔

تم فکر کیوں کرتی ہو۔ وہ میری بہن ہے۔ پر تم جاؤ گی کہاں

کمل کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور چہرے پر سختی چھا گئی۔

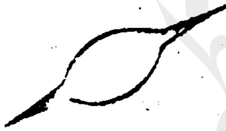
حالات نے جس طرح مجھ سے انتقام لیا ہے اسی طرح میں بھی ان مردوں سے خوفناک انتقام لوں گی۔ میں نے اپنی زندگی کا انتہائی اور بھیانک فیصلہ کر لیا ہے ــــ میں یہ ثابت کر دونگی کہ عورت جب عورت پن کا لبادہ اتار پھینکتی ہے۔ تو سانپ سے زیادہ زہریلی اور طوفان سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔

سائرہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

تم یہیں میرے ساتھ رہو۔

اوں ہوں۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر عمل کر کے رہونگی۔

سٹاف روم سے نکل کر بڑی تیزی سے وہ ہوسٹل کی طرف چلی گئی۔



اپنا اٹیچی اٹھائے کمل ہوسٹل سے نکلی۔ جونہی وہ سڑک پر آئی سامنے نیلے رنگ کی ایک کار کھڑی تھی اور اس میں جہانگیر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ کمل جب اس کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے دروازہ کھول دیا۔

آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

زخمی آواز میں کمل نے پوچھا۔

مجھے یہاں سے نکال کر تمہیں کیا ملا؟

میں نے تمہیں اس خیال کے تحت یہاں سے نکلوایا ہے کہ تم میرے ساتھ جانے پر مجبور ہو جاؤ ــــ یہ تمہاری بھول ہے۔ میں اس وقت بھی تمہارے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہونگی۔ جب میرے سر پر موت کھڑی ہو۔

جہانگیر باہر نکلا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اچھا میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ اب تو چلو میرے ساتھ گھر

میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔

کسی کا دل دکھانا۔ اچھی بات تو نہیں

میرا دل نہیں دکھایا گیا؟

کمل آگے بڑھ گئی۔ جہانگیر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر اس
نے رکشہ کر لیا۔ جہانگیر پھر بھی اس کے تعاقب میں تھا۔ کمل اسی عمارت کے
سامنے رکی جس میں ڈورتھی اپنا کاروبار چلاتی تھی اور جو کبھی اس کی دلالہ تھی۔
جہانگیر وہاں سے لوٹ گیا۔

کمل دوسری منزل پر ڈورتھی کے آفس میں داخل ہوئی۔ وہ اپنے سامنے
کاغذ پھیلائے بیٹھی تھی اور سگریٹ پھونک رہی تھی ــــ کمل کو دیکھتے
ہی وہ پھول کی طرح کھل گئی اور کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

بہت عرصے بعد آئی ہو۔ میں نے تو سنا تھا تم شریفوں کی بستی میں جا چکی
ہو۔ ملنے آئی ہو؟ ــــ یا ــــ کمل نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

پناہ لینے آئی ہوں خانم!

پناہ اور یہاں؟

ہاں خانم! خدا کی اس بستی کے شرفاء کے ظلم وستم سے تنگ آ کر
میں یہاں تمہارے پاس پناہ لینے آ گئی ہوں۔ میں جانتی ہوں۔ تم لوگ یہاں

لڑکیاں خرید کر لاتے ہو جبکہ میں از خود آ گئی ہوں اور اس طرح ہاتھ لگی
ہوئی چیز کی قیمت گر جاتی ہے۔

ڈورتھی نے ایک وقار سے کہا۔

تم نے غلط سوچا ہے۔ یہاں کی ہر چیز کو حسن کے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔
تمہارا حسن غیر یقینی حد تک معیاری ہے۔ بیٹھو تم کھڑی کیوں ہو۔ میں نے سنا
ہے۔ تمہارا باپ مر گیا ہے۔

اٹیچی ایک طرف رکھ کر کمل بیٹھ گئی۔

ہاں میرا مجبور اور بے بس باپ مر گیا ہے۔

پھر تم اور زیادہ لگن سے یہاں کام کر سکو گی۔

خانم! مجھے اس سنسار کے مردوں سے انتقام لینا ہے۔ جو عورت کو
کھلونا جان کر اس سے کھیلتے ہیں۔ میں اب یہاں عزت نہ بیچوں گی خانم کوئی
اور کام دو مجھے۔

خانم نے اس کی تائید کی۔

کون کہتا ہے تم عزت بیچو۔ تمہارے جیسی حسین لڑکی کے لیے بہت کام
ہیں۔ رقص کی تربیت شروع کر دو۔ ایک روز میں تمہیں فلم انڈسٹری کی اوّل صف
کی رقاصہ بنا دونگی۔ اس کے علاوہ چند ہی دنوں میں تجھے میں ماڈل گرل بنا
دونگی۔ میرے پاس کئی کمپنیوں کے ڈھیروں خط آتے ہوتے ہیں وہ
حسین سے حسین تر ماڈل گرلز مانگتے ہیں اور تم سب کے لیے فٹ ہو۔ اس لائن

سے بھی تم بہت کچھ کما سکتی ہو۔

ایک اور بات بتاؤ خانم !

کہو ؟

اس بازار سے باہر عورت عورت کہلاتی ہے۔ پر یہاں آجانے کے بعد رنڈی اور طوائف کیوں کہلاتی ہے۔

خانم نے چونک کر کہا۔

واہ بیٹی ! یہ بھی تم نے خوب کہی۔ تم تو جانتی ہوں۔ ہم لڑکیوں کو پتھروں کے روپ میں یہاں لاتے ہیں۔ ان پتھروں کی تراش خراش کے بعد ان میں سے ہم نایاب موتی نکالتے ہیں اور جب اس موتی کو سجا کر ہم دنیا والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تو یہ پاگل لوگ اس کا نام رنڈی رکھ دیتے ہیں۔

ڈورتھی نے گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ تھرڈ کلاس اور کنڈم سے چہرے والا ایک جوان دروازے پر آکھڑا ہوا۔ شاید چپڑاسی ہوگا۔ ڈورتھی نے اس سے کہا۔

ذرا استاد جی کو بلاؤ۔

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا آفس میں داخل ہوا۔ ڈورتھی نے اس سے کہا۔۔۔۔

استاد جی ! یہ نئی بچی آئی ہے۔ یہ میری عزیزہ ہے۔ رقص کی تربیت کے لیے اسے میں آپ کے حوالے کرتی ہوں۔ ایسی محنت کریں اس پر کہ دھوم مچ جائے اس کی شہر میں۔ ماڈل گرلز کے لیے ہمارے پاس جو ضروریات آتی ہیں اس

کے لیے بھی سب کمپنیوں کو اسے ہی دکھانا ہے۔

استاد جی نے اپنی سفید مونچھیں درست کیں۔

دیکھنا خانم اسے کندن بنا دیں گے ہم

اسے اسی منزل کا کونے والا کمرہ دے دو۔ ادھر کسی کا زیادہ آنا جانا نہیں ہے۔ کوئی اسے اس کی مرضی کے خلاف عزت بیچنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ اس استاد نے کمل سے کہا۔

اُٹھو میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں ۔۔۔ کمل اُٹھ کر اس کے ساتھ ہولی۔

کمل نے چھ ماہ تک دن رات ایک کر کے رقص کی تربیت حاصل کی اس عرصہ میں وہ ٹی وی اشتہاری فلموں میں بطور ماڈل گرل کام کر کے کافی شہرت حاصل کر چکی تھی اور اس کے ذریعے سے ڈورتھی ہزاروں روپے کمانے لگی تھی۔ اس دوران جہانگیر اور اس کے دوسرے پرانے گاہک کئی بار اس کے پاس آتے۔ پر اس کے کہنے پر ڈورتھی انہیں یہ کہہ کر ٹال دیتی تھی کہ وہ کسی اشتہاری فلم کی شوٹنگ پر گئی ہوتی ہے۔ اصل میں وہ ایک مقام حاصل کر کے اپنے انتقام کی ابتدا کرنا چاہتی تھی۔

رقص کی تعلیم مکمل کر کے ڈورتھی اسے فلموں میں بطور رقاصہ لے آئی تھی۔ ایک تو حسین تھی، جسم میں سیکس اپیل بھی بہت زیادہ تھی اور اس پر طرہ رقص میں اس کی مہارت جلد ہی وہ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن کر رہ گئی تھی ہاں ڈورتھی نے اسے ایک نئی اور انتہائی قبیح عادت ڈال دی تھی۔ وہ دن رات

حد سے زیادہ سگریٹ اور شراب پینے لگی تھی ــــ اور کھانسی کی مریض ہو کر رہ گئی تھی
اس کا کمرہ اب خوب سجا دیا گیا تھا جس کے باہر ہر وقت ایک ملازمہ
بیٹھی رہتی۔ عمارت اور عمارت سے باہر دو دلال اس کی حفاظت کے لیے ہمیشہ
اس کے ساتھ رہتے تھے جو اس کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتے۔

اب وہ اپنے ماحول کی آپ مالک تھی۔
رہبر تھی اپنے منزل کی طرف جانے والے کاروان کی۔
وہ شعلہ تھی۔
بجلی تھی ــــ جو کوندتی اور تماشائی دل تھام کر رہ جاتے۔

ایک روز جہانگیر نے ڈورتھی سے فون پر کمل کا پوچھا۔ کمل بھی اس وقت
ڈورتھی کے ساتھ آفس میں بیٹھی تھی۔ ڈورتھی نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کمل سے پوچھا
جہانگیر کا فون ہے کیا کہوں۔

کمل کا چہرہ غصے میں سرخ ہو گیا۔ اسے کہو آجائے۔ پر دس ہزار سے کم رقم میں
کمل تمہیں نہ سنبھالے گی۔ ڈورتھی نے فون پر جس طرح کمل نے کہا تھا ویسے ہی کہہ
دیا اور ریسیور رکھ دیا۔ کمل اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جہانگیر کی کار عمارت کے باہر رکی اور وہ سیڑھیاں چڑھ کر
ڈورتھی کے آفس میں آیا۔ ڈورتھی نے اسے کمل کا کمرہ نمبر بتایا اور گیلری میں کھڑی
ہو کر تماشہ دیکھنے لگی۔ جہانگیر کمل کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے پلنگ پر
نیم دراز تھی۔ اس کے سامنے ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی

تھی اور ایک طرف چھوٹی تپائی پر شراب کی بوتل اور جام پڑا تھا۔ سگریٹ کا
ایک لمبا کش لیکر کمل نے شراب کا ایک گلاس پیا۔ تھوڑی دیر تک کھانستی رہی پھر
جہانگیر سے پوچھا۔

کدھر آئے ہو؟

جہانگیر بڑا مرعوب دکھائی دے رہا تھا۔ ایک تو کمل کے کمرے کی سج دھج
ہی ایسی تھی۔ دوسرے کمل کی صحت اب پہلے سے کئی گنا اچھی تھی جس کے سبب
وہ اور زیادہ حسین ہو گئی تھی اس کی شخصیت ایسی نکھری تھی کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ
جاتا تھا۔ کچھے کچھے سے لہجے میں جہانگیر نے کہا۔

ڈورتھی سے تمہارے متعلق پوچھا تو اس نے کہا آجاؤ دس ہزار میں کام ہو
جائے گا۔ اس لیے چلا آیا ہوں۔ کمل اٹھی۔ بوتل سے جام میں شراب انڈیلی
اور ہلکی ہلکی چسکیوں میں شراب پیتے ہوئے کہا۔

رقم؟

جہانگیر نے دس ہزار کی رقم نکال کر کمل کے سامنے تپائی پر رکھ دی۔ کمل نے
نوٹ سنبھالے اور تالی بجائی۔ دو ہٹے کٹے مرد کمرے میں داخل ہوئے۔ کمل
نے کسی شہزادی کی طرح ان سے کہا۔

ذرا ان صاحب کی خاطر ہو جائے ــــ وہ پھر بری طرح کھانسنے لگی تھی
وہ دونوں آگے بڑھے۔ اور جہانگیر کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ دونوں نے
خوب اچھی طرح جہانگیر کی عزت کی اور دھکے دے کر عمارت سے باہر پھینک دیا

ایک روز بخشو بھی اس عمارت میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کمل کی تصویر
تھی۔ کسی فلم کا پوسٹر تھا۔ جسے وہ بازار سے خرید کر لایا تھا۔ وہ سیدھا ڈورتھی کے
کمرے میں گیا اور کمل کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔

یہ رقاصہ یہیں ہے نا!

ڈورتھی نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا

یہیں ہے۔

کون سے کمرے میں

بارہ نمبر میں

کیا میں اس کمرے میں جا سکتا ہوں۔

وہ کسی کو بٹھاتی نہیں۔

ایک ہزار دونگا۔

نہیں مانے گی۔

پانچ ہزار

مشکل

دس ہزار

ایک لاکھ بھی دو تو نہ مانے۔

بخشو کھڑا ہو گیا۔ تم مجھے اس کے کمرے میں تو جانے دو۔ میں اس کا پرانا
جاننے والا ہوں۔ دس بیس ہزار میں مان گئی تو بخشو نام نہیں۔

اگر پرانے گاہک ہو تو بیشک چلے جاؤ۔

بخشو نے جب کمل کے کمرے میں داخل ہونا چاہا۔ تو باہر بیٹھی ہوئی عورت
ے اسے روکا۔

بی بی کا حکم ہے اندر کوئی نہ جائے۔

بخشو نے اس عورت کو زبردستی ایک طرف ہٹا کر کہا تم فکر نہ کرو — وہ
راض نہ ہوگی۔ میری اس کی جان پہچان ہے۔ بخشو کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر
ل پلنگ پر لیٹی آرام کر رہی تھی۔ اس عورت اور بخشو میں تکرار کے باعث وہ
اگ گئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک خمار تھا۔ ملازمہ
ے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

بی بی! میں نے اسے منع کیا۔ پر یہ زبردستی اندر آگیا ہے۔

کمل سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اپنا لباس درست کیا اور پھر بخشو کی طرف دیکھ کر
ملاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو۔

بخشو فوراً کمل کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمل نے بڑے پیار سے اس
ا طلب کیا کہاں رہے اتنا عرصہ۔ میں تم سے اپنے رویے پر نادم ہوں۔

بخشو کمل اٹھا۔ کوئی بات نہیں۔ صبح کا بھولا ہوا شام گھر آ جائے تو
ں کیا کہاں چلے گئے تھے۔

کراچی رہا ہوں — وہاں ہیرے میں خوب کمایا۔ اس نے جیب میں

ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

کیا پیش کروں۔

کمل نے سیگرٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

کم از کم دس ہزار۔ اس سے زیادہ تمہاری اپنی مرضی۔

بخشو نے نوٹ نکال کر اس کی گود میں رکھ دیئے۔ کمل نے تالی بجائی
اس کے دونوں باڈی گارڈ کمرے میں داخل ہوئے۔ کمل نے انہیں اشارہ
اور وہ دونوں بخشو پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے بخشو کو مار مار کر فرش پر گرا دیا۔

کمل اٹھی اور اور بخشو کے قریب جا کر طنزاً پوچھا۔

کچھ ہوش ٹھکانے آئے ہیں۔

بخشو نے کوئی جواب نہ دیا۔

کمل نے پھر اس کی مرمت کرنے کو کہا۔ اور بخشو کی پھر پٹائی شروع ہو گ
کمل نے دوبارہ اپنے آدمیوں کو روکا اور بخشو سے پوچھا۔

ذہن ٹھکانے لگا ہے؟

بخشو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کمل زور سے چلائی۔ اسے اٹھا کر عمارت
باہر پھینک دو اور بتا دو۔ دوبارہ اگر ادھر کا رخ کیا۔ تو اس سے بھی بدتر حا
بنے گی۔

کمل اب اپنے سب ہی گاہکوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنے لگی
لیکن افسوس وہ دن رات شراب اور سگریٹ پیتی رہتی تھی اور اندر سے کھو
ہوتی جا رہی تھی۔



عظیم اپنے اڈے میں مزدوری کے انتظار میں اپنے ٹھیلے سے ٹیک لگائے
بیٹھا تھا اور اس کا کتا اس کے قریب آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اتنے میں ایک
طرف سے بخشو اور اس کا ایک بدمعاش ساتھی آئے۔ بخشو نے عظیم کی طرف اشارہ
کر کے اپنے ساتھی سے کہا۔

یہ ہے وہ عظیم جس نے اس کمل کی خاطر مجھے بے عزت کر کے نکالا تھا۔ پھر
اس نے عظیم کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

جانتے ہو وہ آجکل کہاں ہے۔ وہ آجکل فلموں میں رقاصہ کے طور پر آرہی ہے
ٹی۔ وی کی اشتہاری فلموں میں ماڈل گرل کے طور پر آرہی تھی۔ ذلیل انسان وہ لڑکی
جس کی خاطر تم نے مجھے ذلیل کیا تھا وہ آجکل طوائف ہے۔ اور اپنی اسی دلالہ

ڈورتھی کی عمارت کے بارہ نمبر کمرے میں رہتی ہے ۔ وہی ڈورتھی جو کبھی اس کے لیے گاہک مہیا کرتی تھی ۔

غلیم کھڑا ہو گیا اور غصے میں لرزتے ہوئے کہا ۔

تم بکتے ہو ۔ وہ طوائف نہیں ہو سکتی ۔

غلیم کے اٹھنے پر کتا بھی انگڑائی لیتا ہوا کھڑا ہو گیا اور بخشو اور اس کے ساتھی دونوں کو گھورنے لگا تھا ۔

بخشو نے چبھتے لہجے میں کہا ۔

تم نے اس کمل کی خاطر میری بے عزتی کی تھی آج میں تم سے اس کا بدلہ لونگا ۔

غلیم نے آستینیں چڑھا لیں ۔ پہلے والی مار کے نشانات شاید مٹ گئے ہونگے

بخشو کا ساتھی چلا کر بولا ۔

ارے یہ دو ٹکے کا مزدور اور اس قدر منہ بھر کے باتیں کر رہا ہے ۔ ذرا بتاؤں نہ اسے دو ہاتھ سارا بھرم کھل جائے گا اس کی بدمعاشی کا ۔

وہ دونوں عظیم کی طرف بڑھے ۔ غلیم بھی تیار ہو گیا تھا اور کتا غصیلے لہجے میں غرانے لگا تھا ۔ بخشو نے آگے بڑھ کر غظیم کو مکا دے مارا ۔ عظیم جھک کر اپنا آپ بچا گیا اور پھر اٹھتے ہوئے ایک سخت مکا بخشو کے پیٹ میں جما دیا ۔

بخشو کا ساتھی جب غلیم کو مارنے لگا تو کتا جھپٹا مار کر آگے بڑھا اور اس کی ٹانگ منہ میں لے کر چبانے لگا ۔ وہ درد کی شدت سے کراہ اٹھا تھا ۔ اتنی دیر تک غلیم نے بخشو کو مار مار کر نڈھال کر دیا تھا ۔

غلیم نے اپنے کتے کو جھڑک کر پیچھے ہٹایا ۔ بخشو کے ساتھی کی ٹانگ چبا دی ی اور خون بہنے لگا تھا ۔ بخشو خوفزدہ ہو گیا تھا ۔ اپنے ساتھی کو لیکر وہ وہاں سے سکا اور اسے رکشے میں بٹھا کر وہاں سے لے گیا ۔

بخشو سے کمل کے متعلق سن کر غلیم کے جسم میں آگ لگ گئی تھی اور ریڑھا کھینچتا ادہ اپنے اڈے سے نکل کھڑا ہوا ۔ ڈورتھی کی عمارت کے باہر غلیم نے اپنا بلہ کھڑا کیا اور سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آیا ۔ کندھے سے اپنی پھٹی ہوئی ض درست کرتا ہوا وہ ڈورتھی کے آفس کے سامنے سے گزرا اور بارہ نمبر کمرے ے سامنے آ گیا ۔ وہاں دروازے کے قریب کرسی پر ایک عورت بیٹھی ہوئی ا غلیم نے اس عورت سے پوچھا ۔

کیا کمل کا کمرہ یہی ہے ۔

اس عورت نے بیزاری میں کہا ۔ یہی ہے پر تمہیں کیا ۔

میں نے اسے ملنا ہے ۔

ہوش میں تو ہوتا ہے ؟

ہوش میں نہ ہوتا ۔ تو یہاں تک کیسے پہنچ جاتا ۔

وہ کسی سے نہیں ملتی ۔ جاؤ چلے جاؤ ۔

تم میرا بتاؤ تو سہی وہ ضرور مجھے اندر بلا لیگی ۔

کیا کہوں اسے ؟

کہنا غلیم ملنا چاہتا ہے ۔

ملازمہ اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹی اور عظیم سے کہا اندر چلے جاؤ
بی بی تمہیں بلاتی ہیں۔

عظیم اندر داخل ہوا۔ کمل ایک سوفے پر دھنسی بیٹھی تھی وہ سگریٹ پر
سگریٹ پی رہی تھی اور شراب کی بوتل اس کے سامنے تپائی پر پڑی تھی شراب
کے خالی پیالے سے ظاہر ہوتا تھا کہ عظیم کے آنے سے قبل کمل اپنے کمرے
میں بیٹھ کر شراب پی رہی تھی۔

کمل سے ہٹ کر عظیم ایک ساگوانی صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک و
کمل کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس سے یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی تیکھے جتونوں وا
کوئی حسین دلواسی۔ اس کی صحت پہلے سے بہت اچھی تھی اور خوبصورت چہ
پکے ہوئے اناس جیسا ہو رہا تھا۔ وہ اور زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ باغِ عدن کے
چکنے پتوں کی طرح دینس کی حسین دیوی کی طرح۔ پھر عظیم کی نگاہیں جھک گئیں ا
وہ اپنی پھٹی ہوئی قمیض چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔ کمل پر کھانسی کا
دورہ پڑا کہ وہ کھانس کر نڈھال ہو گئی۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی تھ
جیسے اس کی چھاتی پھٹ جائے گی۔ بڑی مشکل سے کمل نے کافی دیر بعد ا
آپ کو سنبھالا اور عظیم کی طرف دیکھا۔ جو اس کے سامنے مہاگنی کے کسی قد
سیاہ درخت کی طرح اداس بیٹھا تھا جیسے پرانی یادوں کے سمندر میں دفن
گیا ہو۔ تحلیل شدہ مسکراہٹ اور دبے لہجے میں کمل نے عظیم کو مخاطب کیا

کدھر آتے ہیں آپ؟

عظیم نے سر اُوپر اُٹھایا۔

اف۔

اس کے چہرے پر ہزاروں حسرتیں اور مایوسیاں بکھری ہوئی تھیں۔ تھوک
لتے ہوئے وہ درد بھرے لہجے میں یوں بولا جیسے بنیامہ بانسریاں رات کے وقت
ی گیت گا رہی ہوں۔ کمل نے اُس کی آواز سنی جس میں کرب و درد تھا۔

میرا ایک ساتھی کھوہ گیا تھا۔ اس کی تلاش میں نکلا ہوں۔ شاید یہاں مل
ئے۔ کمل نے پھٹے پھٹے، آزردہ اور زخمی لہجے میں کہا۔

یہاں آکر تو لوگ اپنا سب کچھ کھوہ بیٹھتے ہیں۔ یہاں کسی کو کیا ملے گا۔

لمحہ بھر کے لیے عظیم پر ایک شہوری کیفیت سی چھا گئی۔ پھر وہ اپنے بے کل
ن کی گہرائیوں سے بولا۔

جس کے پاس کچھ ہو ہی نا — وہ کیا کھوئے گا۔

اپنی پراسرار گرم آنکھیں عظیم کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے کمل نے ملائم آواز
کہا —

عزت!

عزت؟ — ہوں — عزت تو لوگ یہاں خشک
ی طرح ہوا میں اچھالتے پھرتے ہیں۔

کمل کی دراز پلکیں جھک گئیں۔ اس کے کانوں میں لٹکتے ہوئے نیلے
یرے آہستہ آہستہ ایک خوش کن تال کے ساتھ ہل رہے تھے۔ پھر

اس کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔
مگر ایسے بازاروں میں عزت بکتی ہے۔
عظیم کے چہرے پر کئی جنگلی سے رنگ بکھر گئے۔ افسوس بھرے انداز میں
اس نے کہا۔
دنیا کی ہر چیز بکتی ہے۔
عزت بکتی ہے۔
خلوص بکتا ہے۔
انسان بکتا ہے۔
ایمان بکتا ہے۔
ہر چیز بکتی ہے۔ کیا نہیں بکتا؟
لالچ کی آڑ میں بھائی بک جاتے ہیں۔
[illegible] کے ہاتھوں ماں اور خلوص کے ہاتھوں بہن بک جاتی ہے۔
عظیم کی آواز اور زہریلی ہو گئی جیسے اس کے پندار پر کسی نے ٹھوکر مار
دی ہو ۔۔۔
لوگ ۔۔۔ انسانیت کے یہ ٹھیکیدار ۔۔۔ مطلب پرست یہ بھیڑیے
اس کی آواز اٹک رہی تھی۔ شاید غصے کے باعث ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ لوگ
عورت کو ماں، بہن اور بیوی کہتے ہیں مگر ۔۔۔
مگر اسی ماں، بہن اور بیوی کو جب وہ غلط راستے پر ڈال لیتے ہیں تو یہ

ظالم لوگ اس کا نام بھی بدل دیتے ہیں اسے عورت نہیں رہنے دیتے۔
کمل رو پڑی تھی اور منہ دوسری طرف کر کے رومال سے اپنے آنسو صاف
کرنے لگی تھی۔ عظیم کی خواب انگیز آواز پھر سنائی دی۔
میرا ایک ساتھی مجبوریوں کے ہاتھوں بک گیا تھا۔ میں جھڑے ہوئے
خشک پتے کی طرح دھکے کھاتے ہوئے اسے تلاش کر رہا ہوں۔
کمل نے نظر بھر کر عظیم کو دیکھا۔ پھر پست و مضمحل آواز میں کہا۔ جس کی
عزت بک گئی ہو اس کی کیا قدر؟
عزت بک گئی تو کیا ہوا۔ یہاں تو لوگ خدا کو بیچ کر بھی اپنا مطلب پورا
کر لیتے ہیں۔ کلرک اپنی تعلیم بیچتا ہے اور پیٹ کا دوزخ بھرتا ہے۔
عالم اپنا علم اور مزدور اپنی محنت بیچتے ہیں۔
ایک بے بس اور مجبور لڑکی نے جس کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔ اپنی کم مائیگی
اور بے زری کی حالت میں اگر اپنا گوہر عصمت بیچ ڈالا تو کون سا ستم ٹوٹ
پڑا ہے۔
کمل رو پڑی۔
آپ جسے تلاش کرتے پھرتے ہیں وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔
عظیم نے آہستگی اور ٹھہراؤ میں کہا۔
نہیں ہے۔ مگر بھٹک گیا ہے ۔۔۔ اسے ضرورت ہے۔
ایک رہبر کی

ایک ساتھی کی

ایک غم گسار کی

ایک ہمدرد اور سہارا دینے والے کی جو اس کا ہاتھ پکڑ کر سیدھے راستے پر ڈال دے اور اپنے ساتھ اپنی منزل کی طرف لے جاتے۔

بھٹکے ہوئے بھی کبھی لوٹتے ہیں ؟

زندگی کی راہ گزر پر ہر کوئی بھٹکتا ہے اور سنبھل جاتا ہے۔

کمل نے مایوسی میں کہا۔

دل ایک شیشہ تھا۔ ایک نامکمل خواب تھا جو ٹوٹ گیا۔ اب کون اسے جوڑیگا عظیم نے بڑے اعتماد اور اشتیاق سے جواب دیا۔ شیشہ اور نامکمل خواب تو کیا۔ ٹوٹتے ہوتے دل جڑ جاتے ہیں۔

بہرحال یہاں ایسا کوئی نہیں جسے آپ اپنا ساتھی کہہ سکیں۔

عظیم سہم سا گیا۔

ہمت ہارنا انسان کا شیوہ نہیں میں کسی کے زخموں پر مرہم رکھتا رہونگا۔ اگر دوا میں اثر اور میری دعاؤں میں خلوص ہوا تو مجھے مایوسی نہ ہوگی۔

کچھ زخم ناسور بن کر لاعلاج ہو جاتے ہیں۔

ان کا بھی کوئی علاج ضرور ہوگا۔

کمل نے اس بار بڑے پیار سے کہا۔

آپ یہاں نہ آیا کریں۔ بدنام ہو جائیں گے۔

عظیم کی آنکھیں غصے میں اُبل پڑیں۔ ان نفس پرست دنیا والوں نے اتنے دکھ دیئے ہیں۔ سمجھونگا ایک اور سہی۔ اس کے بعد بھی اگر تم میرے ساتھ چلی جاؤ۔ تو میں سمجھونگا۔ میں نے کچھ نہیں کھویا۔

میں اب اس دنیا میں واپس نہ جاؤنگی۔ جہاں قدم قدم دھوکا اور سانس سانس فریب ہے۔

خلاؤں میں گھورتے ہوتے عظیم نے کہا۔

وہ میرا ساتھی ہے جو مٹی میں مل گیا ہے۔

ایک موتی ہے جو سمندر میں گر گیا ہے۔

لوگوں نے اسے طوفان میں دھکیل دیا ہے۔

جلتی ہوئی اور بھڑکتی چتا میں ڈال دیا ہے۔

میں اک بندہ نابکار ہی سہی۔ پر قسم خدا پاک کی میں اسے ڈھونڈتا رہونگا۔ اس کے سامنے اپنے دل کا گیت گاتا رہونگا۔ میرا اس کا ایک غیر مرئی بندھن ہے ایک روز وہ اپنے سارے شہابی رنگوں اور میٹھی تڑپ کے ساتھ مجھے ضرور اپنا کہہ پکاریگی اور وہ دن اس کی کٹھن زندگی کا آخری دن ہوگا۔ کمل نے دیکھا عظیم کے چہرے پر نا اُمیدیاں سی گہری ہو گئی تھیں۔ ایک حسرت بھری نگاہ اس نے کمل پر ڈالی۔ پھر وہ اُٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کمل بیچاری اسے دیکھتی رہی۔

اس کے پھٹے ہوتے کپڑے۔

پہلے سے کمزور جسم

لڑکھڑاتی چال

مایوس چہرہ

اور بھیگی بھیگی آنکھیں دیکھ کمل رو پڑی۔ ایک ہارے ہوئے جواری، تھکے ہوتے مسافر اور کچلے ہوئے انسان کی طرح عظیم جب باہر نکل گیا۔ تو کمل اپنے پلنگ پہ گر گئی اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ ملازمہ بیچاری اندر آتی تھی۔ پر اسے روتا دیکھ کر افسردہ چہرہ لیے باہر نکل گئی۔



عظیم اب شاموں اور آفتاب کی طرف سے کچھ بے فکر ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ آفتاب میٹرک کر کے ایک ڈسٹری بیوٹر کے ہاں سیلز مین ہو گیا تھا۔ اور اب وہ اس قابل تھا کہ گھر کے اخراجات چلا سکے۔ چار روز باہر رہنے کے بعد جب عظیم گھر لوٹا اور ٹھیلہ املتاس تلے کھڑا کر کے جب وہ کمرے کی طرف جانے لگا تو اس نے دیکھا۔ کمرے سے باہر سفید رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ وہ کچھ ٹھٹھکا تاہم کمرے میں داخل ہوا۔

اندر شامو کے پاس آسیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ آفتاب شاید ابھی تک اپنی ڈیوٹی سے نہ لوٹا تھا۔ عظیم کو دیکھتے ہی آسیہ کھڑی ہو گئی اور اس کی طرف بڑھی۔ عظیم نے پہلے ہی پوچھ لیا۔

کیسی ہو آسی !

آسیہ نے آگے بڑھ کر پیار سے اس کے ہاتھ تھام لیے ۔

میں ٹھیک ہوں ۔۔ آپ میرے ساتھ گھر چلیے ۔

عظیم بھٹکنے لگا ۔ میرا کوئی گھر نہیں ۔

آسیہ رو پڑنے والی تھی ۔ وہ گھر کس کا ہے ۔ جہاں آپ نے بچپن گزارا ۔ اور جہاں امی اور بہنوں کے ساتھ آپ ایک مثالی زندگی بسر کر رہے تھے ۔

میں اب اس گھر کی دہلیز نہ جھانکوں گا ۔

آسیہ بچاری کھل کر رو دی ۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ۔ اس نے عظیم کے بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا ۔

میں کہتی ہوں میرے ساتھ چلیے ۔ قیصر نے خودکشی کر لی ہے ۔ میں اور ابو نے پچھلے دو دن سے آپ کو بہت ڈھونڈا لیکن آپ نہیں ملے ۔ قیصر جیسا تھا ۔ آخر آپ کا بھائی تھا ۔ ابو بھی میرے ساتھ آنے لگے تھے پھر رک گئے ۔ کہتے تھے تم اکیلی جاؤ شاید میرے ساتھ جانے سے وہ نہ آئے ۔ وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ آپ ان سے نفرت کرتے ہیں ۔

عظیم کی آواز کہیں دور سے سنائی دی ۔

قیصر نے خودکشی کر لی ؟

ہاں !

کب ؟

تین روز ہو گئے ہیں ۔ ابو نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی پر کامیاب نہ ہو سکے ۔ اس نے کچھ کھا لیا تھا اور اپنے کمرے میں پڑا رہا تھا ۔ ہمیں بہت بعد میں خبر ہوئی وہ بھی اس وقت جب میں آپ کے گھر کی صفائی کرنے گئی ۔ اس وقت تک دیر ہو چکی تھی ۔ اور قیصر بچ نہ سکا ۔ عاصفہ نے زبردستی اس سے طلاق لے لی تھی نا ۔ کچھ روز تک وہ بھاگ دوڑ کرتا رہا کہ اس سے صلح ہو جائے پر عاصفہ نہ مانی اور اس نے خودکشی کر لی ۔

کیا وہ مر گیا ہے ۔

ہاں وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے روٹھ چکا ہے ۔ چلیے میرے ساتھ ۔

میں اب وہاں جا کر کیا کروں گا ؟

آسیہ اسے زبردستی کھینچتی ہوئی باہر لائی ۔ میں کہتی ہوں میرے ساتھ چلیے ۔۔ عظیم نے کوئی اعتراض نہ کیا اور اس کے ساتھ ہو لیا ۔ آسیہ نے اسے اپنی کار میں اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھایا اور کار عمارت سے باہر نکل گئی ۔

آسیہ عظیم کو اپنے گھر لیجانے کے بجائے عظیم کے اپنے گھر لے گئی ۔ آسیہ نے گھر کو پہلے جیسا صاف ستھرا رکھا تھا ہر چیز اسی طرح قرینے سے رکھی تھی جس طرح اس کی امی رکھا کرتی تھی ۔ آسیہ نے پہلے سارا گھر عظیم کو دکھایا پھر مسکراتے ہوئے پوچھا ۔

وہی گھر ہے نا ۔

عظیم نے کوئی جواب نہ دیا ۔ آسیہ ایک بڑا تولیہ اور صابن دانی نکال لائی

اور عظیم کا ہاتھ پکڑ کر غسل خانے کی طرف لیجاتے ہوتے کہا۔

پہلے نہالیں۔ یہ پُرانے کپڑے نہ پہنیں۔ اب میں آپ کے دوسرے کپڑے نکالتی ہوں۔ عظیم آسیہ کے سامنے بول نہ رہا تھا۔ بالکل کسی اچھے اور فرمانبردار معصوم بچے کی طرح وہ تولیہ اور صابن لیکر غسل خانے چلا گیا ـــــ وہ جب نہارہا تھا تو دروازے پر رکھے ہوتے اس کے پُرانے کپڑے آسیہ نے اُٹھالیے اور ان کی جگہ نئے کپڑے رکھ دیتے۔

عظیم نے باہر آکر بال بناتے پھر آسیہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر کی طرف لیجاتے ہوتے مسکرا کر کہا۔

چلیئے ابو کے پاس وہ ہمارا انتظار کر رہے ہونگے۔

سعادت اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ آسیہ نے دروازے پر کھڑے ہوکر گنگناتی آواز میں کہا۔

ابو دیکھئے کون آیا ہے ؟

سعادت نے عظیم کو دیکھا پھر وہ اُٹھے تیزی سے آگے بڑھے اور عظیم کو گلے لگاتے ہوتے کہا۔

شکر ہے تم نے بھی اس گھر میں اپنی شکل دکھاتی ہے۔

آسیہ عظیم کے دفاع میں بولی۔

ابو! ابھی ان سے کوئی بات نہ کیجئے۔ پہلے کھانا کھالیں پھر میں خود ان سے بات کرونگی ـــــ

تینوں نے مل کر بڑے پرسکون اور خوش کُن ماحول میں کھانا کھایا۔ پھر سعادت کھڑے ہوگئے اور دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوتے انہوں نے آسیہ سے کہا۔

تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو۔ میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔ شاید وہ ان دونوں کو موقع دینا چاہیئے تھے کہ آپس میں باتیں کرلیں۔ عظیم نے بھی آسیہ کی طرف دیکھتے ہوتے کہا۔

میں اب چلتا ہوں۔

آسیہ اداس ہوگئی ـــ کہاں ؟

مندر اور کہاں۔

مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

کہو۔

میرے ابو اور آپ کی امی نے ہم دونوں کی منگنی کی تھی نا ؟

کی تھی ؟

کیا اس ناطے سے میں آپ سے کچھ کہنے کا حق رکھتی ہوں۔

ضرور

تو پھر اپنے گھر رہیے اور اُسے آباد کیجئے۔

میں کبھی اس گھر ضرور آؤنگا۔ جواب پوری طرح اُجڑ گیا ہے۔ میں اسے آباد کرونگا۔ پر ابھی نہیں۔ ابھی مجھے کسی کی تلاش ہے۔

کس کی تلاش ؟

اپنی زندگی کے ایک ساتھی کی اسی لڑکی کی جس کا نام کمل ہے اور جو مجھے ان دونوں ملنے آتی تھی جب میں پاگل اور کمرے میں بند تھا۔

کب تک اسے ڈھونڈتے رہیں گے۔

میں اسے ڈھونڈ چکا ہوں۔ وہ ایک ویران اور تاریک کنوئیں میں ہے۔ میں نے اسے وہاں سے نکالنا ہے۔

اگر نہ نکال سکے تب ؟

پھر میں تمہارے پاس آجاؤنگا۔ اور جس طرح تم کہوگی کرونگا۔

آسیہ نے بڑی آس اور اُمید سے کہا۔

میں آپ کے گھر میں آپ کا انتظار کروں گی۔ ابو نے میری شادی کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ میں نے انہیں کہا تھا۔ آپ ایک بار مجھے عظیم کے حوالے کر چکے ہیں اور میں موت تک عظیم کی واپسی کا انتظار کروں گی۔ میں نے ڈاکٹری کر لی ہے اور اب میں ابو کے کلینک میں کام کرتی ہوں۔

عظیم کھڑا ہو گیا۔ میں اب چلتا ہو۔

پھر کب آئیں گے۔

کبھی ضرور آؤنگا۔ عظیم مڑا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو پیچھے سے آسیہ کی آواز سنائی دی۔

ٹھہریئے گا !

عظیم نے مڑ کر دیکھا کیوں

میں آپ کو گاڑی میں چھوڑ کر آؤں گی۔

آسیہ نے گاڑی نکالی۔ اور عظیم کو لیکر مندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب وہ دونوں مندر میں داخل ہوتے تو وہاں عاصفہ کی کار کھڑی تھی۔ عظیم کے ساتھ نیچے اترتے ہوئے آسیہ نے کہا۔ یہ گاڑی تو عاصفہ کی ہے ۔ آج میں اس سے بھی بات کرتی ہوں۔

آسیہ عظیم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اندر عاصفہ بیٹھی تھی۔ عظیم کے بولنے سے قبل ہی آسیہ اس پر برس پڑی۔

اب تم عظیم کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑی ہو۔ آنٹی، عطیہ اور بے بی پہلے ہی تمہاری وجہ سے موت کے منہ میں چلی گئیں۔ قیصر سے تم نے طلاق لے لی اور وہ بھی خودکشی کر کے ہمیشہ کے لیے ہم سے روٹھ چکا ہے۔ اب ہمارے پاس اس گھر کی نشانی صرف عظیم رہ گئے ہیں اگر تمہاری وجہ سے انہیں کچھ ہو گیا تو یاد رکھنا آسیہ تمہیں زندہ نہ چھوڑے گی۔ اب اچانک تمہاری محبت کیوں جاگ اٹھی۔ اس وقت کہاں تھی۔ جب عظیم کو چھوڑ کر قیصر سے شادی کر لی تھی۔ اٹھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے اور یہ یاد رکھنا۔ عظیم میرے منسوب ہیں اور ان کی سلامتی کی خاطر میں اپنی جان بھی گنوا سکتی ہوں۔

عاصفہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ ایک حسرت سے عظیم کو دیکھتی ہوئی باہر

نکل گئی۔ شاید وہ آسیہ کی موجودگی میں کچھ کہنا نہ چاہتی تھی ـــ آسیہ
بھی اس کے پیچھے پیچھے اپنی گاڑی لے کر چلی گئی۔



کھڑ کھڑ کی آواز کے ساتھ ٹھیلہ کھینچتا ہوا عظیم ڈور بھی کی عمارت کے باہر رکا۔
...ر پھر سیڑھیاں چڑھ کر کمل کے کمرے کے پاس آیا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا
...وہی بوڑھی عورت جو کمل کے کمرے سے باہر بیٹھتی تھی۔ کمرے کی صفائی کر رہی تھی
...ے عظیم نے اس سے پوچھا۔

کمل کہاں ہے؟

ملازمہ اس بار بڑے اچھے طور سے پیش آئی۔

وہ یہاں نہیں باہر گئی ہیں۔

کہاں۔

فلم کی شوٹنگ پر گئی ہیں۔

کہاں ؟

یہ پتہ نہیں۔

کب تک آئے گی۔

کچھ خبر نہیں کب آئیں۔ ویسے دو چار روز تک آ ہی جائیں گی۔

عظیم خاموش ہو گیا۔ آنکھوں میں ویرانی نمایاں ہو گئی اور چہرے پر افسردگی کے نقوش گہرے ہو گئے۔ سر جھکاتے جب وہ مڑنے لگا تو ملازمہ نے پوچھا۔

آپ بی بی کے رشتہ دار ہیں کیا ؟

عظیم نے دکھ سے کہا۔

انسانیت کے نام پر ہر انسان دوسرے کا رشتہ دار ہے۔

یہ تو ٹھیک ہے۔ پر بی بی کسی کو بٹھاتی نہیں۔ اس روز تمہیں کافی دیر تک کمرے میں بٹھایا اور جب تم چلے گئے تو بی بی بیچاری سارا دن اپنے کمرے میں بند ہو کر روتی رہی تھی۔

عظیم بھی مغموم ہو گیا۔

رشتہ تو ضرور ہے۔ پر زمانے کی گردش نے ایسی راہیں بدلی ہیں کہ نہ منزل رہی اور نہ منزل کی نشاندہی کرنے والے راستے۔

بڑھیا نے آہ بھر کر کہا۔

زمانہ بڑا ظالم ہے۔ اس دور میں جینا کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ آپ بی بی کو رلایا نہ کریں وہ بیمار ہیں۔ زیادہ سگریٹ اور شراب پینے سے ان کے پھیپھڑوں میں ورم

ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کرنے کا مشورہ دے رکھا ہے۔ لیکن وہ دن رات کام کر کے اپنے آپ کو مصروف رکھتی ہیں۔ اس طرح ان کی تکلیف اور بڑھ گئی ہے۔ انہیں کھانسی کے بڑے بھیانک دورے پڑنے لگے ہیں۔ ملازمہ خاموش ہو گئی اور عظیم سر جھکاتے باہر نکل گیا۔

ہفتے کا وقفہ ڈال کر عظیم پھر وہاں آیا۔ ملازمہ کمرے سے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کا مطلب تھا کمل آئی ہوئی ہے۔ ملازمہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

بی بی اندر ہی ہیں۔ آجائیے !

عظیم اسی صوفے پر بیٹھ گیا۔ جہاں پہلے روز بیٹھا تھا۔ کمل نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب ایک طرف رکھ دی۔ انگلیوں میں دباتے ہوئے سگریٹ کے جلتے ٹوٹے سے اس نے دوسرا سگریٹ سلگا کر کش لیا اور عظیم سے مخاطب ہوئی۔

آپ میری غیر موجودگی میں بھی آئے تھے ؟

عظیم نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔

آیا تھا۔

کوئی ضروری کام ہے کیا ؟

دیکھنے آیا تھا کہ اس روز کی بات چیت کا کوئی اثر ہوا ہے۔

پھر نادان ہیں آپ ؟

نادان نہ ہوتا تو آج یوں کتے کی طرح در بدر کی ٹھوکریں کیوں کھاتا پھرتا

یہ تو اپنی قسمت ہے۔

قسمت کا جال بھی انسان خود ہی بنتا ہے۔

کبھی کبھی حالات کی ستم ظریفیوں کا دھارا اس قدر تیز ہوتا ہے کہ انسان اپنا رخ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

عظیم نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ پر یہ سب کچھ عارضی ہوتا ہے۔ انسان کوشش کرے تو اس دھارے پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ نہیں تو بھٹک چکنے کے بعد پھر اپنی اصل راہ پر آسکتا ہے۔ کمل نے طنز کیا۔

کہاں واپس آسکتا ہے؟ جہاں دھکے ہی دھکے ہوں؟

گردش میں ہی تو کامیابی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا اگر تم پھر وہی کراچی کی پسلی میں کیماڑی کی رہنے والی کمل بن جاؤ تو سارے چکر ختم ہو جائیں گے۔

یہ نہیں ہو سکتا۔ وقت گذر چکا ہے۔ اور میں بہت دور نکل گئی ہوں۔ کمل اپنی جگہ سے اٹھی۔ اپنے کمرے کے اندر لوہے کا ایک کیبنٹ کھولا۔ سو سو کے نوٹوں کی ایک وزنی گٹھی نکال کر مڑھی اور دو نوٹ عظیم کے سامنے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

آپ یہ لیجائیں اور اپنی حالت سدھارلیں۔

عظیم نے نوٹ اٹھا کر کمل کی گود میں پھینک دیئے۔ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ میں ان کی خاطر نہیں۔ صرف تمہیں لینے آتا ہوں۔

میں نہیں جاؤنگی۔

عظیم کی آواز کپکپا گئی۔ نہ سہی۔ تمہیں کوئی مجبور تھوڑا ہی کر سکتا ہے۔

کمل کچھ کہنے لگی تھی کہ ایک بار وہ کھانسی پھر اسے کھانسی کا ایسا دورہ پڑا نہ

وہ دہری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور سگریٹ ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ شاید چکر آگئی تھی۔

عظیم اس کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ کمل کی حالت جب کچھ سنبھلی تو عظیم نے جیب میں ہاتھ ڈالا کچھ نوٹ نکالے اور اٹھ کر کمل کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

یہ دو سو روپیہ ہے۔

کمل نے فوراً پریشانی میں پوچھا۔

کیسے؟

جب میری ماں اور بہنوں کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تو کراچی سے آتے ہوئے تم نے مجھے چھ سو روپیہ دیا تھا۔ میرے پاس رقم ہوتی تو یکمشت ہی تمہیں ادا کر دیتا۔ دو سو کی قسطوں میں تمہاری وہ رقم میں پوری کر دونگا۔

کمل غم سے پگھل سی گئی۔

مجھے اب ان کی ضرورت نہیں۔

پر میں کسی کا مقروض نہیں مرنا چاہتا۔

میں نے یہ قرض معاف کیا۔

میں اتنا بے غیرت نہیں کہ ایک عورت سے لی ہوئی قرض کی رقم نہ اتار سکوں۔ ابھی میں جوان ہوں میرے بازوؤں میں قوت ہے۔ میں محنت مزدوری کر سکتا ہوں۔ جب بوڑھا ہو گیا تو چپ چاپ اپنے آپ کو موت کے حوالے

کر دوں گا۔

کمل بالکل بیلی ہوگئی۔ قبل اس کے وہ کچھ کہتی ملازمہ اندر آئی وہ ایک ٹرے اٹھائے ہوئے تھی جس میں دو بوتلیں اور تین پلیٹوں میں کچھ کھانے کی چیزیں تھیں ملازمہ نے ٹرے عظیم کے سامنے تپائی پر رکھ دی اور کمل کا اشارہ پاکر باہر نکل گئی۔ کمل اٹھی اور عظیم کے سامنے کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔

کمل نے بوتلوں کے ڈھکن کھولے اور عظیم سے کہا۔

پیجئے!

عظیم نے کوئی جواب نہ دیا اُلٹا کمل سے کہا۔

مجھ پر ایک احسان کرو۔

کیا؟

مجھے یہ بتا دو، سیبل کہاں ہے تاکہ میں یہ دیکھ سکوں کہ تمہارے اور اس کے شُوں میں کتنا فرق آگیا ہے۔

کمل کہیں کھو گئی۔ پھر وہ اُٹھی اور ایک کاغذ پر سیبل کا پتہ لکھ کر عظیم کو تھما دیا۔ عظیم کھڑا ہوگیا۔ میں اب چلتا ہوں۔

کمل نے بوتلوں کی طرف اشارہ کیا یہ تو پی کر جائیں۔

ابھی میں اس قابل نہیں۔ جب اس قابل سمجھونگی پی لونگا۔ عظیم باہر نکل گیا اور کمل اسے حسرت سے دیکھتی رہ گئی۔

کمل کے پاس سے نکل کر عظیم نے اپنا ٹھیلہ اڈے پر کھڑا کیا اور بس سے وہ

سیبل کے سکول جا پہنچا۔ ہوسٹل کے گیٹ پر کھڑے ہو کر اس نے چوکیدار سے سے سیبل کو بلانے کے لیے کہا۔ چوکیدار نے اسے استقبالیہ میں بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد استقبالیہ میں سیبل داخل ہوئی اور بھیا! بھیا پکارتی ہوئی وہ عظیم سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ عظیم کا جی بھی بھر آیا تھا۔ عظیم کے سامنے بیٹھتے ہوئے سیبل نے تُتلاتیا کہا۔

اس مندر والی عمارت سے نکل کر ہم نے بہت دھکے کھائے بھیا۔ وہاں سے ہم دونوں بہنیں ریلوے اسٹیشن آئی تھیں۔ ایک شخص جو اصل میں بدمعاش تھا۔ اس نے باجی کو بہن کہا اور ہم دونوں کو اپنے کوارٹر لے گیا۔ وہاں اس نے باجی کی عزت لوٹنا چاہی۔ پر باجی گھر سے ایک چاقو لیکر نکلی تھی۔ بس وہ چاقو آڑے آیا اور باجی نے اپنے آپ کو اس بدمعاش سے بچالیا۔

وہاں سے نکل کر رات کو ہم نے اپنی زندگی کا سب سے برا وقت دیکھا۔ اس رات بڑی سردی تھی۔ بارش بھی ہو رہی تھی۔ ایک رحم دل قلی نے ہمیں پناہ دی وہاں رہتے ہوئے باجی کو اسکول میں سروس بھی مل گئی۔ پر ایک روز بخشو وہاں پہنچ گیا اور اس نے بدنام کر کے باجی کو وہاں سے بھی نکلنے پر مجبور کر دیا۔

پھر ہم دونوں بہنیں اسی ہوسٹل میں رہنے لگیں۔ پر تقدیر شاید ہم دونوں بہنوں پر خوش نہ تھی۔ یہاں بھی باجی کا ایک شنا سا آنکلا۔ اس نے باجی سے شادی کرنا چاہی۔ جب باجی نے انکار کر دیا تو اس شیطان نے باجی کی ساری

داستان ہیڈ مسٹریس سے کہہ دی۔ اور یوں باجی کو اس سکول سے بھی نکال دیا گیا۔ سیبل نے دیکھا عظیم کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوتے سیبل کھڑی ہو گئی۔

میں آپ کے لیے بوتل منگواؤں بھیا۔

عظیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رہنے دو بے بی۔ پر سیبل نے ہاتھ چھڑا لیا اور باہر بھاگی۔ چوکیدار سے اس نے دو بوتلیں لانے کو کہا اور دوبارہ عظیم کے پاس بیٹھتی ہوتی بولی۔

اب باجی سے ناراض کیوں ہیں بھیا۔

ہاں تھوڑا ناراض ہوں بے بی۔ وہ ہی مجھ سے بات نہیں کرتی۔ میں تو اب بھی اس سے ملنے اس کے پاس جاتا ہوں۔

سیبل نے حیرت سے کہا

باجی تو کہتی تھیں۔ عظیم ہم سے ناراض ہیں ۔۔ اب پتہ چلا وہ جھوٹ کہتی رہی ہیں۔ جب ہم دونوں بہنیں دھکے کھا رہی تھیں تو میں باجی سے کہتی تھی۔ باجی ہم عظیم بھائی کے پاس چلی جائیں اور جس طرح ابو کی مرضی تھی آپ۔ اُن سے شادی کر لیں۔ پر باجی رو پڑتی تھی اور کہتی تھی عظیم ہم سے ناراض ہیں۔

چوکیدار دو بوتلیں دے گیا اور وہ پینے لگے۔

سیبل نے پوچھا۔ آپ ابھی تک اسی مندر میں رہتے ہیں بھیا

ہاں وہی رہتا ہوں۔

کوئی سروس ملی۔

نہیں ٹھیلہ ہی کھینچتا ہوں۔

سیبل افسردہ ہو گئی۔

آپ یہ کام چھوڑ دیں بھیا۔ یہ بہت سخت کام ہے۔ آپ تھک جاتے ہونگے باجی کی اب کافی واقفیت ہے۔ میں انہیں کہونگی وہ آپ کے لیے کہیں سروس کا بندوبست کریں۔

نہیں بے بی اسے مت کہنا۔ میں یہی کام کرونگا۔

نہیں بھیا۔ آپ یہ کام کیوں کریں گے۔

عظیم نے بات کا رخ بدلا۔ کمل تمہیں ملنے آتی ہے۔

آتی ہے بھیا۔ کم از کم مہینے میں دو بار تو ضرور آتی ہے۔

کتنے پیسے دے کر جاتی ہے۔

میری ضرورت سے زیادہ ہی دے جاتی ہیں ۔۔۔ ایک خوشخبری بھی کہوں آپ سے۔

کیا ؟

باجی کوشش کر رہی ہے کہ کوئی بنی بنائی کوٹھی خرید لے پھر آپ بھی ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے بھیا۔

کمل نہیں مانیگی۔

کیوں نہیں مانیگی۔

عظیم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بیس روپے نکالے اور سیبل کی طرف بڑھائے۔

یہ رکھ لو سیلے بی!

سیبل نے نوٹ لیکر دوبارہ عظیم کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔
آپ کو قسم ہے بھیا۔ اگر آپ مجھے کچھ دیں۔
اچھا میں اب چلتا ہوں۔ عظیم کھڑا ہو گیا۔ سیبل دروازے تک اسے چھوڑنے آئی پھر اندر چلی گئی۔

اندھیرا پھیل گیا تھا

گھپ اندھیرا

روشنی اور تاریکی کے ننگ دھڑنگ نقوش ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر چہار دانگ بکھر گئے تھے۔ شروع ساون کی ٹھنڈی پروا ہر چیز پہ خمار بکھیر رہی تھی۔ عظیم ریڑھا کھینچتا ہوا عمارت میں داخل ہوا۔ آج وہ بے حد اداس تھا۔ کمل نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر کے اس کا دل جو توڑ دیا تھا۔ ٹھیلہ املتاس تلے کھڑا کر کے وہ وہیں بیٹھ گیا۔

اسی لمحہ شاموں باہر نکلا۔ اس نے شاید ٹھیلے کے پہیوں کی آواز سن لی تھی۔ وہ عظیم کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ عظیم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں

شاموں نے اسے پکارا۔ عظیم!

عظیم چونکا اور آنکھیں کھول دیں۔

آج بہت دیر کر دی بیٹا!

بس ہو گئی بابا!

اداس اور پریشان بھی ہو؟

وہ تو سدا ہی سے ہوں

کمل کے پاس تو نہیں گئے تھے؟

گیا تھا۔

پھر کیا کہتی ہے

کسی کی مجبوری کو کون مانتا ہے بابا!

یہاں نہیں آتی؟

نہیں۔

وجہ؟

بس گرے ہوئے کو ہر کوئی کچلتا ہے۔

یہ تو شیوہ ہے۔ اس دنیا کا

عظیم نے املتاس سے ٹیک لگائی اور لمبا سانس لیا۔ یہ دنیا خوش رہے بابا! اپنی خبر ہے۔ کچھ کٹ گئی ہے۔ کچھ کٹ جائے گی۔ مجھے تو اپنے رشتہ دار چھوڑ گئے ہیں۔ کمل سے کیا شکوہ وہ تو پرائی لڑکی ہے۔

شاموں نے سوچتے ہوئے کہا۔ آج پھر عاصفہ آئی تھی۔

آنے دو آتی ہے میں کیا کروں۔

کل بھی آئی تھی۔ بہت روتی تھی بیچاری

اس کی قسمت میں ہی اب رونا ہے

میری مانو اس سے شادی کر لو

نہیں بابا۔ اس سے شادی کے متعلق میں اب سوچ بھی نہیں سکتا

پھر ایک کام اور کرو

کیا

کسی طرح کمل کو یہاں لے آؤ۔ میں اسی سے تمہاری شادی کرا دیتا ہوں۔

بوڑھا شاموں جذباتی ہو گیا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں بیٹے! تمہاری خوشی سے ہی اب میری خوشی ہے۔

عظیم پگل کر رہ گیا۔ میں جانتا ہوں بابا! لاہور جیسے عظیم شہر میں جگہ جگہ دھکے کھا رہا تھا۔ میرے پاس سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔

میری کوئی منزل نہ تھی

کوئی آرزو نہ تھی

میری حالت سڑکوں پر آوارہ گھومنے والے کتوں سے بھی بدتر تھی۔ اس وقت میں بے سہارا تھا۔ میرے عزیزوں نے دھتکار رہا تھا۔ اس وقت جبکہ ——— جبکہ میں ٹہنی سے ٹوٹا ہوا ایک خشک پتا تھا۔ تم نے مجھے سہارا

دیا۔ میرے رہنے کا بندوبست کیا۔ مجھے محنت مزدوری اور جفاکشی کی سیدھی راہ پر لگایا۔ میں تمہارا مشکور ہوں۔ احسان مند ہوں۔ ہاں مرگیا تو میری روح بھی تمہاری ممنون رہے گی۔

ورنہ تم جانتے ہو بابا۔ یہ دور .... اس دور میں ——— تو کون کسی کو پوچھتا ہے۔ لوگ تو مطلب نکالتے ہیں خواہ دوسرے کی جان ہی چلی جائے۔ انسان سستا ہوگیا ہے۔ اپنے خون تک میں کشش نہیں رہی۔

یہ دنیا؟

آہ

اس ظالم دنیا میں شانتی اور سکون ختم ہوگئے ہیں۔ ہر کوئی جستجو میں ہے۔ ہر کوئی بھٹک رہا ہے۔ ہر ایک متلاشی ہے۔ مگر سکون؟

سکون کہاں

ہر کوئی سوداگر ہے۔

ہر چیز بکتی ہے۔

انسان انسان کا خون پی رہا ہے۔ دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی ہے بابا!

اب ہم جیسوں کا جینا بھی کوئی جینا ہے۔ انسانیت بنات النعش سے زمین کے پاتال کی طرف بھاگ رہی ہے۔

عظیم اور زیادہ غصّے میں آگیا۔ کمل سے بات چیت میں اس کا دل جو ٹوٹا ہوا تھا۔ بے کسی میں اس نے کہا۔

یہ دور؟

ہائے ——— اس دور میں ماں بکنے لگی ہے۔

بہن بیٹیاں لٹنے لگی ہیں۔

یہ ——— یہ بڑی بڑی توندوں والے سیٹھ

یہ لمبی لمبی کاروں والا طبقہ

شراب پیتے ہیں۔ ——— دوسری کی بیٹیوں کا رقص دیکھتے ہیں۔

یہ ——— یہ دوسروں کی عزت سے کھیلنے والے دیوتا

کیا ان کے ہاں بیٹی نہیں

ان کے ہاں بیوی نہیں

ان کی کوئی ماں نہیں ہے۔ ان کا رقص کیوں نہیں دیکھتے۔ انہیں سرعام کیوں نہیں نچواتے۔ کیونکہ یہ دولت کی جھلک پر اوروں کی امانتیں چھین لیتے ہیں ان کے ہاں بھی ہر چیز ہے۔ ہر رشتہ ہے۔ پر انسان ہی بدل گیا ہے بابا۔ انسانیت ہی کہیں کھو گئی ہے۔ لوگ دوسروں کی تکلیف پر ہنستے اور قہقہے لگاتے ہیں۔ خدا پیدا ہی نہ کرتا اس دور میں تو بہتر تھا۔

رشتوں کی آڑ میں سانپ ہیں۔

قدم قدم پر خونخوار بھیڑیے ہیں۔

ہر کوئی ڈسنے کو بھاگتا ہے۔

ہر کوئی چیز پھاڑنے کو دوڑتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کتا کتے کا بیری۔ میں کہتا ہوں کتا کتے کا نہیں۔ انسان انسان
کا بیری ہے۔ شاموں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بہت جذباتی ہو گئے ہو۔
لگتا ہے کمل سے جھگڑا کر آئے ہو۔

چند لمحوں کے سکوت کے بعد بوڑھا شاموں بولا۔

اب اگر عاصفہ آئے تو میں؛ سے کیا کہوں۔ وہ آج کئی روز سے میرے پاؤں
پکڑ پکڑ کر سماجتیں کر رہی ہے کہ عظیم کو مجھ سے راضی کر دو۔

عظیم نے رکھائی سے کہا۔ اب اگر یہاں آئے تو اسے نکال دینا۔ دھکا دے
دینا اسے یہ تو اچھی بات نہیں۔

کہنا عظیم مر گیا ہے۔

میں اتنی بڑی بات کیونکر کہہ سکتا ہوں۔

پھر جو تمہارے جی میں آئے کہہ دینا۔ پر یہاں آنا بند کر دے۔

وہ بہت مجبور ہے۔

کبھی میں بھی مجبور تھا۔

بات بات پر رونے لگتی ہے۔ تمہاری خاطر ہی اس نے اپنے شوہر سے
طلاق لے لی ہے۔

کبھی میں بھی اپنی تقدیر پہ بہت رویا تھا جب اس نے کسی کی خاطر مجھے
چھوڑ دیا تھا۔

اس سے انتقام لینا چاہتے ہو۔

انتقام تو اس سے تقدیر لے گی۔

عظیم نے بڑی بیزاری سے کہا۔

تم اس کی اتنی طرفداری کیوں کر رہے ہو بابا

شاموں نے دکھ سے کہا۔ اس کی حالت آجکل عجیب ہو رہی ہے۔ بات
بات پر اس کے آنسو آجاتے ہیں۔ جسم کانپنے لگتا ہے اور ٹھنڈے پسینے آنے
لگتے ہیں۔ بیچاری کو۔ کہہ رہی تھی اب تو اکثر میرا دل بھی ڈوبنے لگا ہے۔ عظیم میرے
بیٹے میں تو کہتا ہوں اس سے شادی کر لو۔ گرے ہوئے انسان کو کچلنا نہیں چاہئے۔
یک مجبور کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔

عظیم کہیں دور سے بولا۔ یہ نہیں ہو سکتا بابا! میں کمل کو چھوڑ کر عاصفہ کو نہیں
پنا سکتا۔ میں کمل کا انتظار کرونگا۔ ایک روز میں اسے اپنی راہ پر لا کر چھوڑوں گا۔
خواہ اسی کشمکش میں بوڑھا کیوں نہ ہو گیا۔ پر میں اسے اپناؤنگا ضرور۔ وہ میرے
پاس ضرور آئے گی بابا! خواہ موت سے چند گھڑیاں ہی پہلے آجائے۔ پھر بھی
سمجھونگا میری محنت بیکار نہیں گئی۔

بابا! میں اپنی منزل کا یقین کر چکا ہوں اور اس سے انحراف نہیں چاہتا۔
سی میں میرا فائدہ۔ میری بھلائی ہے۔ کمل میری منزل ہے۔ بابا! اگر کمل مجھے نہ ملی
و اس کے بعد میرا سب سے زیادہ حق دار میری سب سے عزیز متاع آسیہ
ہو گی۔ جس سے میری ماں نے میری منگنی کی تھی اور وہ خوددار اور محبت کرنے
والی لڑکی اب بھی میرے گھر بیٹھ کر میری واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ تم نے دیکھا

نہیں بابا! وہ عاصفہ سے کہیں زیادہ حسین اور پر خلوص ہے۔

دونوں چند لمحوں تک خاموش رہے۔ عظیم بھی سر جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر وہ جوالا مکھی بن کر پھٹ پڑا۔

بابا! عاصفہ نے جیسا سلوک میرے ساتھ کیا۔ اس کی سزا اسے ملنی چاہیے

—— ضرور —— ضرور ملنی چاہیے۔

کئی لوگ اس سے عبرت پکڑیں گے۔

کئی بھٹکی ہوئی عورتیں اس کے کردار سے نصیحت پکڑیں گی۔

یہ تقدیر کا فیصلہ ہے بابا! میں مجبور ہوں کچھ نہیں کر سکتا۔

وہ تڑپے گی جس طرح میں تڑپا تھا۔

وہ بھی پاگل ہو گی جس طرح میں ہوا تھا۔

مجھ پر قہقہے لگانے والوں پر لوگ قہقہے لگائیں گے۔

شاموں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ دفع کرو ایسی باتوں کو اٹھو اندر چل کر کھانا کھاؤ۔ عظیم اٹھا اور شاموں کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

سورج ابھی طلوع ہی ہوا تھا۔ آفتاب کمرے سے باہر چولہے پر بیٹھا ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ املتاس سے ٹیک لگائے شاموں حقہ پی رہا تھا اور اس سے قریب ہی عظیم اپنے ٹھیلے کے پہیئے پر پانی ڈال رہا تھا۔ اتنے میں ایک کار احاطے میں داخل ہوئی۔ عظیم کے قریب آ کر کار رکی اور عاصفہ اس میں سے اتری۔ عظیم نے ایک بار اسے دیکھا۔

وہ اداس اور پریشان تھی۔

غمگین اور افسردہ تھی۔

عظیم بے تعلق سا ہو کر پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

شاموں نے حقہ پینا بند کر رہا تھا۔ ناشتہ بناتے ہوئے آفتاب کے

ہاتھ رک گئے تھے اور وہ دونوں عظیم اور عاصفہ کی گفتگو کا انتظار کرنے لگے تھے۔

عاصفہ چپ چاپ عظیم کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ عظیم نے اسے گھور کر دیکھا۔

کیوں آئی ہو یہاں۔

کچھ دیر تک عاصفہ بول نہ سکی۔ شاید اپنے آپ پر قابو پا رہی تھی۔ پھر بڑی مشکل سے اس نے جواب دیا۔

میں ——— میں آپ سے اپنی غلطی کی معافی مانگنے آئی ہوں۔

معاف کرنے والا تو خدا ہے۔ اس سے معافی مانگو۔

آپ معاف کر دیں پھر شاید خدا بھی معاف کر دے۔

غلطی کس کی تھی؟

میری

مجھے پاگل کس نے بنایا؟

میں

میری ماں اور بہنوں کا قاتل کون تھا؟

میں

قاتل کی سزا؟

قتل

پھر

عاصفہ رو پڑی۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیجئے میں اُف نہ

کہوں گی ———

میں تو پہلے ہی گناہ گار ہوں؟

ایک گناہ اور سہی میری خاطر

جو خود ختم ہو چکا ہو وہ کسی کو کیا ختم کرے گا۔ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دو۔

تقدیر خود تم سے انتقام لے گی۔

حالات خود اپنے آپ کو دہرائیں گے۔

آج یہاں سے آپ کو میری لاش ہی اٹھا کر باہر پھینکنا ہو گی۔

یہ کام بھی کوئی اور ہی کرے گا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔

ماسا شاموں اپنی جگہ سے اٹھا۔ بیساکھیاں ٹیکتا ہوا وہ ان دونوں کے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ قریب آکر اس نے دونوں سے کہا۔

دونوں اندر جا کر آرام سے بات کرو۔ باہر شور کرنے کا کیا فائدہ جس نے نہیں سنا وہ بھی سنے گا۔ عاصفہ فوراً اندر چلی گئی۔ عظیم املتاس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میں نہیں جاؤں گا اندر اسے کہو چلی جائے یہاں سے

شاموں نے بڑی شفقت سے کہا۔ گھر آئے ہوئے انسان کی بے عزتی نہیں کرنی چاہئے۔ عظیم غصے میں کھڑا ہو گیا ——— چلو میں اس سے بات کرتا ہوں۔ یہ روز روز کا تماشہ ہی ختم ہو جائے۔ اندر آتے ہی عظیم عاصفہ پر برس پڑا۔

میں نے تمہیں منع نہ کیا تھا یہاں مت آیا کرو
عاصفہ نے بڑی عاجزی سے کہا۔ کہا تھا۔
پھر تم کیوں آئی ہو۔
میں مجبور ہوں ۔
عظیم زور سے چلا۔ مجبور! مجبور! مجبور! ہر کوئی اپنی جگہ مجبور ہے۔ میں نے
تمہیں کہا تھا نا میں تم سے نفرت کرتا ہوں ۔
عاصفہ افسردہ ہو گئی —— جی
اور یہ بھی کہا تھا مجھے کسی اور سے محبت ہے اور مجھے اس کی تلاش ہے
کہا تھا مگر میں آپ کو ایک طوائف سے شادی نہ کرنے دونگی۔
عظیم برس پڑا۔
طوائف وہ نہیں۔ تم ہو۔ میری نگاہوں میں وہ پھول سے بھی زیادہ پاکیزہ
ہے ——
عاصفہ ہکلنے لگی تھی — ہو گی —
تو پھر جاؤ چلی جاؤ یہاں سے ۔
عاصفہ نے دکھ سے کہا۔ میں آپ کو ساتھ لیے بغیر نہ جاؤنگی۔ آپ کے
بغیر اب میری زندگی ادھوری ہے۔
عظیم نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔
اس وقت تم کہاں تھی جبکہ رات کے اندھیرے میں قیصر کا ہاتھ تھام کر

تم نے کہا تھا۔ میں عظیم سے نہیں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں ۔ اس وقت تم کہاں
تھی۔ جب میں کراچی دھکے کھاتا رہا۔ اس وقت تمہاری محبت کو کیوں زنگ لگ
گیا تھا۔ جب میری ماں اور بہنیں مر گئی تھیں اور کسی نے میرا دکھ نہ بانٹا تھا۔
اس وقت تم کہاں تھی۔ جب میں پاگل ہو گیا۔ انکل اور آسیہ کے علاوہ اس وقت
میرا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔
عظیم کہتا رہا
تم میری ماں اور بہنوں کی قاتل ہو
میری بربادی کی ذمہ دار ہو
میری زندگی کی سب سے بڑی ٹھوکر ہو۔
میں اپنے قاتل کو گلے کا ہار کیوں بنا لوں
کیوں اس ٹھوکر کو میں پاؤں کی زنجیر بنا لوں —— بولو —— جواب دو۔
گھگھیائی آواز میں عاصفہ نے کہا۔
گناہ کے بعد تو خدا بھی توبہ قبول کر لیتا
عظیم نے ویسے ہی غصے میں کہا
توبہ کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ توبہ تو فرعون نے بھی کی تھی۔ پر خدا نے
اسے قبول نہ کیا۔ عظیم جب باہر نکلنے لگا تو عاصفہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو
پکڑ لیا۔ عظیم نے اسے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔
کیا ہے ؟

عاصفہ رو پڑی۔ میرے ساتھ آج فیصلہ کر کے جائیے۔

کیسا فیصلہ؟

جس کے لیے میں آئی ہوں۔

فیصلہ تو اس روز ہی ہو گیا تھا جس روز تم نے قیصر سے شادی کر لی تھی۔

وہ میری غلطی تھی

غلطی کی سزا بھگتو

صرف ایک بار معاف کر دیں۔ پھر زندگی بھر ایسی غلطی نہ کروں گی۔

خدا سے معافی مانگو

پہلے آپ تو معاف کریں۔

میں نے تمہیں کہا تھا نا۔ میں کمل سے شادی کروں گا

جی کہاں تھا۔

تم جب قیصر سے شادی کرنے لگی تھی۔ میں نے کوئی اعتراض کیا تھا۔

نہیں کیا تھا۔

اب جبکہ میں کمل سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو تم کیوں شور کرنے لگی ہو۔ کیوں تمہیں تکلیف ہونے لگی ہے۔ خاموش رہو اور قسمت کا تماشہ دیکھتی رہ میرا آج بھی یہی جواب ہے کہ مجھے تم سے نفرت ہے اور کل بھی۔

عظیم باہر نکلا۔ اپنے ٹھیلے کے پاس آیا اور اسے کھینچ کر باہر لے جانے لگا۔ آفتاب اپنی جگہ سے اٹھا اور بھاگ کر عظیم کا راستہ روک لیا۔

ناشتہ کر کے جاؤ بھیا

عظیم نے غصے میں آفتاب کو ایک طرف ہٹا دیا۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔

آفتاب بھاگتا ہوا اندر گیا اور شاموں سے کہا۔

بابا! عظیم بھیا کھانا کھائے بغیر ہی کام پر جا رہے ہیں۔

شاموں اپنی بیساکھیاں ٹیکتا ہوا تیزی سے باہر نکلا اور عظیم کو آواز دی۔

عظیم! عظیم۔ رک جاؤ بیٹے۔ تمہیں قسم ہے جو نہ رکو۔

عظیم رک گیا۔ شاموں اس کے قریب آیا اور دکھ سے کہا۔

کھانا تو کھا کر جاؤ بیٹے!

عظیم نے ہلکے سے کہہ دیا۔

بھوک نہیں ہے بابا!

شکستہ سی آواز میں شاموں نے کہا۔

بھوکے یہ ٹھیلہ کیسے کھینچو گے۔ چلو واپس چلو۔

آفتاب نے بھی منت کی۔

کھانا کھا کر جاؤ نا بھیا!

عظیم نے شاموں کی طرف دیکھا۔ بڑی ہی بے بسی کی سی حالت میں۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ دونوں کی نگاہوں میں آنسوؤں کا بوجھ تھا۔ پھر عظیم نے پگھلا دینے والی آواز میں کہا۔

میری طبیعت پہلے ہی خراب ہے بابا! مجھے اور زیادہ پریشان نہ کریں۔

مجھے بھوک ہوتی تو کھا لیتا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے اور زیادہ نہ الجھائیں
عظیم اپنا ریڑا کھینچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ شامو کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے
موٹے قطرے بہہ نکلے تھے۔ وہ اپنی آستینوں سے اپنی آنسو پونچھتے ہوئے عظیم کو
جاتا دیکھ رہا تھا۔ آفتاب کا سر بھی جھک گیا تھا۔ دونوں سر جھکاتے واپس آگئے۔

عاصفہ کے پاس آکر شامو پھٹ پڑا۔

تم یہاں مت آیا کرو بیٹی! تمہاری وجہ سے عظیم ہم سے بھی روٹھ گیا ہے۔
وہ میرا بیٹا ہے اور میں اب اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ میری سانسوں
کا تعلق اور میرے سر پہ کی آتا ہے۔ شامو فرش پر بیٹھ کر رونے لگا۔ عاصفہ
سر جھکاتے باہر نکل گئی۔ وہ بالکل گم سی دکھائی دیتی تھی۔ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں
کرتی وہ کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔



سہ پہر کے قریب عظیم نے اپنا ریڑھ ڈوڈ بھٹی کی عمارت کے باہر روکا اور
اوپر چڑھ کر کمل کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمل اپنے ، پلنگ پر گہری نیند سو
رہی تھی۔ وہ صوفے پر جا کر بیٹھ گیا اور کمل کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔
تھوڑی دیر تک وہ خود بھی وہاں بیٹھے بیٹھے اونگ گیا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو کمل اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ عظیم نے آنکھیں ملیں۔
اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کمل نے اس کی حالت پر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کب آئے آپ۔

اپنی ادھڑی ہوئی آستین درست کرتے ہوئے عظیم نے جواب دیا۔ کافی دیر
سے آیا ہوا ہوں۔

اگر آپ کوئی چیز کھائیں تو منگواؤں۔

نہیں

پھر حکم کریں۔

میں آج آخری فیصلہ کرنے آیا ہوں

کیسا فیصلہ

تمہیں ساتھ لیجانے کا

وہ فیصلہ تو میں کئی بار پہلے بھی دے چکی ہوں۔

پر مجھے وہ منظور نہیں

آپ کیا چاہتے ہیں۔

تمہیں آج میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ لوگ مجھے طرح طرح کی باتیں سنانے لگے ہیں۔ میں آج تمہیں ساتھ لیجا کر ہر ایک کا منہ بند کر دینا چاہتا ہوں۔

پر میں نہیں جاؤنگی۔

عظیم نے اس کا بازو پکڑ لیا اور پہلی بار وہ غصے میں غرایا۔

تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

کمل نے اپنا بازو عظیم کے ہاتھ میں ہی رہنے دیا اور اسے چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ پھر اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

کوئی زبردستی ہے کیا۔

غصے میں عظیم نے تن کر کہا۔ ہاں زبردستی ہے۔

پھر آپ کی بھول ہے۔

تو تم نہیں جاؤ گی۔

نہیں

پھر سوچو

نہیں

عظیم نے کمل کو اپنی طرف کھینچا اور دو بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے اور غصے میں زور سے غرایا۔

ذلیل کمینی! تمہاری خاطر میں کہاں سے کہاں چلا آیا اور تم پر اثر ہی نہیں۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی تو کیوں مجھ سے اتنی ہمدردی بڑھائی۔ کیوں تم نے مجھ سے عمر بھر میرا انتظار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

میں تمہیں گناہوں کی دلدل اور دھسان سے نکالنا چاہتا ہوں اور تم اس کی گہرائی میں جاتی ہو۔

کمل رونے لگی۔ عظیم غصے میں زور سے غرایا

کہاں گئی وہ کمل جب میں کراچی سے چلا تو وہ رو پڑی تھی۔

تم عورت نہیں طوائف ہو۔

لوگ مجھے ٹھیک ہی طعنہ دیتے ہیں۔

عاصفہ ٹھیک ہی کہتی تھی تم طوائف ہو۔

تم گناہ گار ہو۔ عادی گناہ گار

یوں جگہ جگہ عزت بیچنے سے تو بہتر تھا کہیں ڈوب مرتیں لوگ یہی کہتے
فرانسس کے ہاں لڑکی نہ تھی ۔ یہ تو نہ کہتے فرانسس کی بیٹی طوائف ہے تمہارے
باپ کی روح کیا کہتی ہوگی ۔

تم ـــ تم خوشی یہ دھندا کرتی ہو ـــ تم ـــ عظیم نے کمل کو بالوں سے
پکڑ لیا اور کئی طمانچے اس کے منہ پر دے مارے ۔ کمل فرش پر گر کر کراہنے لگی تھی ۔
عظیم نے اسے پاؤں کی ایک سخت ٹھوکر ماری ۔ کمل شدتِ تکلیف سے کراہ اُٹھی ۔
اس پر غشی سی طاری ہوگئی اور منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی ۔

اسی لمحہ کسی نے پیچھے سے عظیم کی گردن پر چکرا دینے والا مکہ دے مارا ۔ عظیم
نے مڑ کر دیکھا ۔ کمل کے دونوں باڈی گارڈ اس کے سامنے کھڑے بھوکے بھیڑیوں
کی طرح اس کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ دونوں آگے بڑھے اور عظیم پر ٹوٹ
پڑے ۔ عظیم بھی مستعد ہوگیا تھا اور سانڈوں کی طرح ان پر برس پڑا ۔ وہ دونوں دائیں
بائیں ہو کر عظیم پر مکے برسا رہے تھے ۔ جواب میں عظیم بھی انہیں اپنے مکوں کی سخت
باڑھ پر رکھے ہوئے تھا ۔

کمل جب کچھ سنبھلی تو اس نے دیکھا وہ تینوں بُری طرح آپس میں لڑ رہے تھے
عظیم کی پیشانی پھٹ گئی تھی اور وہاں سے خون بہہ رہا تھا جو اس کی قمیض کو
رنگین بنا رہا تھا ۔ کمل کے اپنے ۔ باڈی گارڈ بھی خون آلود تھے اور اس بوڑھے
بیل کی طرح ہانپ رہے تھے جو دھوپ میں طویل محنت کے بعد فارغ ہوا ہو ۔
کمل لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور اپنے دونوں باڈی گارڈ کے منہ پر اس نے

طمانچے مارنے شروع کر دیئے ۔

ذلیل کمینو !

بے غیرت نمک حرامو !

کس نے تمہیں ان پر ہاتھ اٹھانے کو کہا ۔ آج یہ مجھے جان سے مار دیتے تو
میری خوش قسمتی تھی ۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے ۔ دونوں محافظ باہر نکل گئے ۔ کمل اپنی
ساڑھی کے پلو سے جب عظیم کی پیشانی صاف کرنے لگی تو عظیم نے نفرت سے
اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا ۔

دُور رہو مجھ سے ۔

کمل نے عظیم کا بازو پکڑ کر اپنے بستر کی طرف کھینچا ۔ ادھر آ کر لیٹیں میں ڈاکٹر
کو بلاتی ہوں ۔

عظیم کی قمیض جو لڑتے لڑتے پھٹ گئی تھی ۔ اسے اس نے اپنے بدن
پر درست کرتے ہوئے کہا ۔ میں جا رہا ہوں ۔ آج کے بعد میرا تمہارا کوئی ناطہ
نہیں ـــ

کمل اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ۔

میں آپ کو اس حالت میں باہر نہ جانے دونگی ۔

عظیم نے اسے دھکا دیکر ایک طرف ہٹا دیا ۔ تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے
والی کمل رو پڑی ۔ میں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں ۔ میں وہی کرونگی جو آپ کہیں گے
میں آپ کی خاطر سب کو چھوڑ دونگی ۔ ذرا ٹھہریئے میں ابھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں

عظیم اس وقت بے پناہ غصے میں ۔ لہٰذا اس نے کمل کی باتوں کی طرف کوئی
دھیان نہ دیا ۔ ورنہ وہ ایسا سنگدل تو نہ تھا کہ کمل کو اپنے ساتھ نہ لیجاتا ۔ اس نے
کمل کو دھکا دیکر فرش پر گرا دیا ۔

دُور ہو میری نگاہوں سے ۔ عظیم تیزی سے باہر نکل گیا ۔ کمل عجیب طرح سے
نڈھال ہو رہی تھی ۔ بڑی مشکل سے وہ اُٹھی ۔ بری طرح لڑکھڑا رہی تھی ۔ قدم رکھتی
کہیں اور پڑتا کہیں تھا ۔ ڈگمگاتی ہوئی وہ عظیم کے پیچھے لپکی پر ایک کرسی سے
ٹکرائی اور جھول کھاتی ہوئی بری طرح دیوار سے لگی ۔ بڑی بے بسی کے عالم میں
اس کے منہ سے نکلا ۔

آہ میں مرگئی ۔ اور وہ وہیں گر کر ڈھیر ہوگئی ۔ ملازمہ بھاگتی ہوئی اندر داخل
ہوئی اور اسے سنبھالنے لگی ۔

اپنا ٹھیلا کھینچتا ہوا عظیم ابھی عمارت سے نزدیک ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے
اسے پکارا ۔ عظیم ! عظیم ۔ اس نے مڑ کر دیکھا ۔ کمل کی بوڑھی ملازمہ بھاگتی ہوئی
آ رہی تھی ۔ عظیم رک گیا ۔ ملازمہ بھاگتی ہوئی عظیم کے پاس آئی اور روتے ہوئے عظیم
کی منت کی ۔ آپ فوراً واپس چلئے ۔ بی بی کی حالت نازک ہے ۔ اس کے منہ
سے خون بہہ رہا ہے اور سانس اکھڑتی جا رہی ہے ۔

عظیم پریشان ہوگیا ۔ وہ واپس آیا ۔ ٹھیلہ باہر کھڑا کیا اور بھاگتا ہوا وہ کمل
کے کمرے میں داخل ہوا ۔ کمل فرش پر گٹھڑی کی صورت میں پڑی تھی ۔ عظیم نے
جھک کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور پلنگ پر لٹا دیا ۔ کمل نے آہستہ آہستہ

یں کھولیں ۔ عظیم کو دیکھ کر وہ ہلکا سا مسکرائی پھر نحیف سی آواز میں پوچھا ۔
آپ آگئے ہیں ۔

عظیم نے کمل کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر سہلاتے ہوئے کہا تم میری جان ہو ۔
سہمی سہمی سی آواز میں کمل نے کہا ۔

میں گناہ گار تھی ۔ اپنے آپ کو آپ کے قابل نہ سمجھتی تھی ۔ آپ وہ ہستی ہیں
میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار پیار کیا ہے ۔ میں کسی روز خود آپ کے
مندر میں چلی آتی لیکن جس روز آپ چوک ناخدا میں میرے ساتھ ناراض ہوتے
مجھے شبہ ہوگیا تھا کہ آپ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں دوبارہ آپ کے پاس آنے
بل میں اطمینان کرلینا چاہتی تھی کہ بے آبرو ہو چکنے کے بعد بھی میری آپ
نگاہوں میں وہی وقعت ہے ۔ آپ میری جان ہیں ۔ آپ کی محبت میرے دل
ندہ ہے ۔ اور محبت کے یہ نقوش کوئی مٹا نہیں سکتا ۔ میں مرنے کے بعد
———— کمل خاموش ہوگئی اور فوراً اپنے دونوں ہاتھ اپنے دل
لے گئی وہ بڑے کرب کا اظہار کر رہی تھی ۔

کافی دیر بعد کمل سنبھلی ۔ پھر اس کی یوں نحیف اور کمزور آواز سنائی دی گویا وہ
لمتے الم میں بھاگ بھاگ کر تھک گئی ہو ۔

عظیم ! میری جان ! میرے بعد سیبل کا خیال رکھنا ۔ آپ کے سوا اس کا اس
یا میں کوئی نہیں ہے ۔ کمل کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی تھی ۔
اس کے آنسو اس کے گلابی گالوں پر بہتے ہوئے اس کی لمبی سفید گردن پر

گرنے لگے تھے ۔

علیم نے چونک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

مایوسی کی باتیں نہ کرو ۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی ۔ ٹھہریں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔
کمل نے بڑی ہی مشکل سے علیم کا وہ ہاتھ جو اس کے منہ پر رکھا تھا۔ تھام لیا۔ اور علیم کی ہتھیلی کو انتہائی کوشش کے بعد چومتے ہوئے کہا۔

میں ایک مسافر ہوں اور رخصت ہو رہی ہوں ۔ میں غم اور دکھ کے سوا آپ کو کچھ نہ دے سکی ۔ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں ——— کمل لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی ۔ علیم کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے اور اس نے وارفتگی کے عالم میں کمل کو اپنی گود میں سمیٹ لیا تھا۔

چند لمحوں بعد کمل کی ٹوٹتی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔

میں ——— میں اس جہاں میں آپ کا انتظار کروں گی ——— آہ علیم ——— کمل کے ہاتھ سے علیم کا ہاتھ چھوٹ گیا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ علیم نے چونک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ بیچاری مر چکی تھی۔ عمارت کے سارے کارکن وہاں جمع ہو گئے تھے اور رونے لگے تھے ۔ علیم جو کمل کو گود میں لیے رو رہا تھا۔ اس مسافر کی طرح تھا جسے لوٹ کر یکتا، تنہا اور بے سرو سامان کر دیا گیا ہو ———



کمل کی کفن میں لپٹی ہوئی لاش اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے علیم اس کے کمرے سے باہر نکلا۔ بوڑھی ملازمہ نے بڑی محنت سے کمل کی لاش کو سنوارا تھا۔ علیم جب ڈورتھی کے آفس کے قریب آیا تو وہ ڈورتھی اپنے کارکنوں کے ساتھ اداس کھڑی تھی اسے دیکھتے ہی علیم نے غصے میں چلا کر کہا۔

صلیب کے علمبردارو! یہ ہے اس راستے پر چلنے کا انجام جس راہ پر تم نے اس لڑکی کو چلا دیا تھا۔ ظالمو! اس کی طرف دیکھو اس کے ہونٹ تم لوگوں سے کچھ کہنے کے لیے اب بھی کھلے ہیں۔ گناہ گارو! یہ وہ بے بس اور لاچار لڑکی ہے جس نے اپنے باپ کے ساتھ امن، سکون اور شانتی کی تلاش میں کراچی سے لاہور تک کا سفر کیا۔ لیکن تم لوگوں نے اس سے اس کا باپ چھین لیا۔ اسے

ایسی راہ پر ڈال دیا۔ جو ان منزلوں کی طرف جاتی ہے۔ جہاں ہر وقت گھمبیر اندھیرا اور بھیانک تاریکی رہتی ہے ۔ گندگی اور بے حیائی کے ناخداؤ مرنے والی بے مجبور و بے بس لڑکی بھی خدا رکھتی ہے ۔ اور وہ خدا ایک روز تمہارے ان اعمال بد کی تم لوگوں کو سزا ضرور دیگا ——— عظیم سر جھکاتے آگے بڑھ گیا۔

کمل کی لاش اُٹھائے عظیم باہر آیا اور لاش اس نے اپنے ٹھیلے میں ڈال دیا۔ اور سر جھکائے آہستہ آہستہ وہ اپنے ٹھیلے کو کھینچنے لگا۔ آج پہیوں سے نکلنے والی صدائیں کیسی افسردہ اور اداس لگ رہی تھیں۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈورتھی اور اس کے کارکن بھی تھے۔ ان سب کا رُخ قبرستان کی طرف تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیل گئی تھی۔ آسمان پر کالے اودھے بادل چنگاڑ رہے تھے۔ کمل کو دفن کر کے عظیم ٹھیلا کھینچتا ہوا مندر آیا۔ ریڑھا اس نے ایک طرف کھڑا کیا اور املتاس کے خاکستری تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ آج وہ حد سے زیادہ اداس تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر بیچارہ لٹ چکا تھا۔ اس کا کتّا بھی اس کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا تھا دونوں نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ دونوں ہی بھوکے اور اداس تھے

تھوڑی دیر بعد کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

عظیم ! عظیم !

عظیم نے آنکھیں کھولیں اس کے سامنے بوڑھا شامون اور آفتاب کھڑے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر شامون نے پوچھا۔

یہاں آ کر کیوں بیٹھ گئے ہو ؟ ——— عظیم جب خاموش رہا تو شامون پھر بولا۔ تمہارے انکل تمہیں لینے آتے تھے۔ عاصفہ پاگل ہو چکی ہے۔ تمہارے انکل کہہ رہے تھے وہ اسی کمرے میں بند ہے جس میں کبھی تم ہوا کرتے تھے۔ تمہارے انکل اس کا علاج کر رہے ہیں۔

عظیم جب پھر بھی خاموش رہا تو شامون نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پدرانہ شفقت میں پوچھا۔

آج دیر سے لوٹے ہو کہاں چلے گئے تھے ؟

گلے میں پھنسی پھنسی سی آواز میں عظیم نے جواب دیا۔

آج میں اس زندگی سے تھک گیا ہوں بابا !

شامو بگل کر رہ گیا۔ کیا ہوا میرے بیٹے !

عظیم بالکل بچوں کی طرح سسک کر رو پڑا۔

کمل مر گئی بابا !

شامون کے بدن پر جیسے کسی نے اُبلتا ہوا پانی انڈھیل دیا ہو لرزتی آواز میں اس نے پوچھا۔

کمل مر گئی ہے مگر کب۔

سسکیوں میں عظیم نے کہا!

میں ابھی ابھی اسے دفن کر کے آ رہا ہوں۔ ان ظالم لوگوں نے اسے مجھ سے چھین لیا ہے۔ پھر عظیم بُری طرح پھٹ پڑا۔

میں ہار گیا ہوں بابا!

تقدیر کی ٹھوکروں نے مجھے دبوچ کر شکست سے دوچار کر دیا ہے۔

کس سے گلہ کروں۔

کس سے شکوہ کروں۔

کیسے پکار پکار کہوں کہ میں مظلوم اور بے بس بنا دیا گیا ہوں۔

کس سے کہوں ان نفس پرست لوگوں نے مجھے دوزخ کی تاریک اور سلگتی غاروں میں دھکیل دیا ہے۔ الٰہی تو مجھے سنبھلنے کی توفیق عطا فرما۔ میری قسمت میں اگر یہ بھی نہیں تو اے دونوں جہاں کے مالک! مجھے موت دے دے تاکہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔

باہر اب بارش ہونے لگی تھی۔ شاموں نے اپنے آنسو پونچھے اور عظیم کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

اٹھو اندر چلو بیٹے! بارش شروع ہوگئی ہے۔

عظیم اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھا۔ شاموں اور آفتاب اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ کمرے میں آکر بستر پر بیٹھنے کے بجائے عظیم فرش پر ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔

شاموں نے منت کے انداز میں کہا۔

اٹھ کر بستر پر بیٹھو بیٹے!

مرتی اور بھیچی بھیچی آواز میں عظیم بولا۔

بابا! آج میں اداس ہوں آج ——— آج مجھے وہی گانا سناؤ جو تم لوگ اس روز گا رہے تھے جس روز میں اس مندر میں داخل ہوا تھا۔ سناؤ بابا! انکار نہ کرنا میرا دل ٹوٹ جائے گا۔

شاموں اور آفتاب دونوں رو رہے تھے۔ پھر شاموں نے لکڑی کی ایک پیٹی کھول کر اس میں سے اپنا ہارمونیم نکالا۔ آفتاب بھی آگے بڑھا اور اسی پیٹی میں سے اس نے اپنا ڈھولک نکالا۔ دونوں عظیم کے سامنے بیٹھ گئے۔ دونوں کچھ دیر تک ساز کی ہم آہنگی درست کرتے رہے۔ پھر ——— پھر بوڑھے شاموں کی بین کرتی دل فگار و غم زدہ آواز سنائی دی۔

میرے ہمدمو! میرے رفیقو!

قبل اس کے مسجدوں میں اذان ہو اور کوزہ گر اپنے چاک کو حرکت دیں۔

قبل اس کے طویل شب کی بیداری کے بعد راہب اٹھیں اور عبادت کی گھنٹیاں بجائیں۔

میرے ساتھیو! میرے چارہ گرو!

اس سے پہلے کہ مچھیرے اپنی کشتیوں کے بادبان کھول دیں۔

اس سے پہلے کہ سورج کی پیلی شعاعیں عدم کی آتشی خوشبو لیکر چاروں طرف بکھر جائیں۔

اس سے پہلے کہ فطرت کے ہاتھ تخلیق اور فنا کے لیے اٹھیں اور اس فانی جہاں میں خوشی اور ماتم کے گیت سنائی دیں۔

اٹھو!

آؤ ہم محنت کر کے اپنے لیے امن و سکون کے جزیرے تلاش کریں۔ ورنہ بھوک کے شعلے اپنی آگ اگلتی زبانیں نکالے ہماری طرف بڑھ کر ہمیں خاکستر کر دیں گے۔

میرے دوستو! میرے رفیقو
اٹھو!

بلند و بالا خیالات کی تسکین توڑ کر ہم اپنے لیے خشک روٹی اور باسی سبزی کا سامان کر لیں۔ میرے فرزندو! آؤ۔ دنیا کی ابتدا اور آغاز کے گیت گائیں اور ظلمت میں اپنے لیے نور کی تلاش کریں۔ اگر ہم اکناف عالم میں پھیل کر محنت اور کشمکش کریں تو تاریک رات ایک ماں کی طرح ہمارا ساتھ دے گی۔

آؤ! آؤ دوستو! محنت کشی اور علوِ ہمتی کے ساتھ آپس میں روحی مفاہمت کر کے ہم انسانیت کو گرسنگی کے گڑھوں اور قنوطیت کے نشیب سے نکال لیں۔

گیت ختم ہو گیا۔ شاموں نے ہارمونیم بجانا بند کر دیا۔ آفتاب کے ہاتھ ڈھولک پر ساکت ہو گئے۔ عظیم جو جھکائے رو رہا تھا۔ کھڑا ہو گیا۔ شاموں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

کہاں چلے ہو بیٹا!

آنکھیں خشک کرتے ہوئے عظیم نے کہا۔

اپنے آخری ساتھی کی تلاش میں۔

بابا۔ بارش ہو رہی ہے بیٹے! دیکھو بادل کیسے گرج رہے ہیں اور بجلی چمک رہی ہے۔

دروازے پر کھڑے ہوتے ہوتے عظیم نے کہا۔

فطرت کے یہ جنگجو عناصر میرا راستہ نہیں روک سکتے بابا! میں ایک ایسے مسافر کی تلاش میں جا رہا ہوں جو برسوں سے میرا انتظار کر رہا ہے۔ آج ——————

آج کی شب اس کا طویل انتظار ختم ہو جائیگا۔

کب لوٹو گے؟

کل آؤنگا۔

عظیم مندر سے نکل کر سڑک پر آیا۔ اس کا کتا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ عظیم نے رکشہ کیا۔ کتے کو بھی اس نے اپنے ساتھ بٹھانا چاہا۔ پر وہ رکشے کے اندر نہ آ رہا باہر ہی کھڑا رہا۔ رکشہ جب چل دیا تو کتا ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

اپنے گھر کے سامنے آ کر عظیم نے رکشہ فارغ کیا اور اپنے کتے کے ساتھ اپنے گھر داخل ہوا۔ اس کمرے کے اندر جو کبھی اس کا ہوا کرتا تھا چھن چھن کر روشنی باہر آ رہی تھی۔

بارش میں عظیم کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔۔ آسمان سے زور دار مینہ برس رہا تھا۔ عظیم آگے بڑھ کر اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ شیشے میں سے اس نے اندر دیکھا۔ آسیہ عظیم کے پلنگ پر لیٹی ٹیبل لیمپ کی روشنی میں مطالعہ کر رہی تھی۔ عظیم تھوڑی دیر تک شیشے میں سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے دروازے

پر دستک دی۔

آسیہ نے کتاب بند کر کے میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

کون ہے؟

علیم کی ڈوبی ڈوبی، مدھم اور مغموم آواز سنائی دی۔

میں علیم ہوں!

آسیہ اچھل کر پلنگ سے اتری۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی بے پایاں مسکراہٹ — علیم کے آنے کی خوشی میں وہ چپل پہننا بھول گئی تھی اور ننگے پاؤں دروازے کی طرف بھاگی۔ اس نے جب دروازہ کھولا تو علیم اندر داخل ہوا۔ وہ بارش میں بھیگا ہوا تھا اور کپڑے نچڑ رہے تھے۔

آسیہ نے علیم سے قریب ہوتے ہوئے بڑی آس اور امید میں پوچھا کیا آپ —— علیم نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

میں ہمیشہ کے لیئے تمہارے پاس آگیا ہوں۔

آسیہ پھول کی طرح کھل اٹھی — آپ کے اس ساتھی کا کیا ہوا جس کی آپ کو تلاش تھی۔

علیم کا سر جھک گیا تھا۔

وہ ہمیشہ کے لیئے مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔

آسیہ آگے بڑھی اور وارفتگی کے عالم میں والہانہ طور پر وہ بری طرح علیم سے لپٹ گئی اور اپنا سر علیم کی چھاتی پر رکھتے ہوئے اس نے پرسکون لہجے میں

کہا ——

آپ میرے ہیں —

علیم نے بھی آسیہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ باہر ابھی تک موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ کالے سیاہ بادل ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے چنگھاڑ رہے تھے اور —— اور بجلی کی تیز لہریں بار بار آسمان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوند جاتی تھیں۔ بائیں طرف سعادت کے مکان کی طرف عاصفہ کے جنونی قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ وہ وہاں ایک کمرے میں بند تھی۔ پاگل جو ہو گئی تھی۔

ختم شد